مکمل ناول

نبیلہ ابر راجہ

میں گماں نہیں یقیں ہوں

چوتھی قسط

سارا منظر ہی دھندلا رہا تھا۔ اس کے واپسی کے لیے باہر کی طرف پلٹتے قدم جیسے یکایک ہی لڑکھڑانے لگے۔ آوازیں اس کے کانوں میں چیخ رہی تھیں۔ وہ ان پہ غور نہیں کرنا چاہتی تھی پر وہ اسے اپنی طرف بلا رہی تھیں۔ پلٹنے پہ مجبور کر رہی تھیں۔ اس نے نہ چاہتے ہوئے بھی غور سے سنا۔ یہ تو اس کے گھر کی تعمیر میں لگی ایک ایک اینٹ کی آواز تھی اس نے بمشکل تمام آوازوں سے پیچھا چھڑاتے ہوئے آگے کی طرف قدم بڑھائے۔ یہاں بھی آوازیں اس کا دامن تھام کے فریاد کرنے لگیں۔

درخت، گھاس، لان کی دیوار، براؤن آہنی گیٹ سب ہی اسے التجا کر رہے تھے کہ خدارا اپنے بڑھتے قدم پیچھے ہٹالو۔ چھوٹا سا سوٹ کیس ہاتھ میں تھامے وہ تیز تیز قدموں سے گیٹ کی طرف جارہی تھی۔

اس نے ہزار جتن کرکے آوازوں کی طرف سے دھیان ہٹایا۔ اب وہ گیٹ سے باہر تھی۔ سب آوازیں پیچھے رہ گئی تھیں۔ اس نے پیچھے مڑ کر براؤن گیٹ اور سبزے سے ڈھکی دیوار کو دیکھا دونوں خاموش تھے مایوس تھے انہیں یقیناً" پتا چل گیا تھا کہ وہ اب واپس پلٹنے والی نہیں ہے۔

وہ ٹیکسی میں بیٹھ کر کومل کے پاس اس کے گھر پہنچی تھی۔ اتفاق سے گھر میں کومل اور ملازموں کے سوا اور کوئی نہیں تھا کیوں کہ اس کے مما پاپا ایک فیملی فنکشن میں گئے ہوئے تھے۔ کومل کا جانے کا موڈ نہیں تھا اس لیے وہ گھر رک گئی تھی۔ ایک لحاظ سے رنم کے حق میں یہ اچھا ہی ہوا کیوں کہ کومل کے گھر پہ نہ ملنے سے اسے پریشانی لاحق ہو سکتی تھی۔

کومل اسے دیکھ کر فوراً" کھٹک گئی کہ کوئی نہ کوئی بات ضرور ہے۔ کیوں کہ رنم کے پاس ہینڈ بیگ کے علاوہ ایک چھوٹا سا سوٹ کیس بھی تھا۔ اس کے چہرے پہ حد درجہ پریشانی چھائی ہوئی تھی۔ دروازہ جیسے ہی کھلا وہ کومل کو ہاتھ سے ہٹاتی جھپاک سے اندر داخل ہوئی جیسے کسی کے دیکھ لیے جانے کا خطرہ ہو۔ بیٹھتے ہی اس نے رونا شروع کر دیا۔ کومل کے تو ہاتھ پیر پھول گئے۔

"ارے کیا ہوا ہے کچھ بتاؤ تو۔ میرا دل ہول رہا ہے۔" اس نے چھٹی بار بڑے صبر سے اپنا سوال دہرایا۔ پر رنم اسی رفتار سے روتی رہی۔ دسویں بار اس نے جھنجلائے ہوئے انداز میں پوچھا تب رنم نے منہ کھولا۔

"میں گھر چھوڑ آئی ہوں۔" کہیں دھماکا ہوتا تو شاید کومل کی ایسی حالت نہ ہوتی جو اب ہو رہی تھی اسے تو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔ شاید اسے سننے میں غلطی ہوئی تھی۔ بڑی مشکل سے اس کے منہ سے آواز نکلی۔

"کک۔۔۔ کیا کہہ رہی ہو تم مذاق تو نہیں کر رہی نا۔" کومل کے منہ سے بے یقین سا جملہ برآمد ہوا۔

"نہیں۔۔۔ نہیں ہاں میں ہمیشہ کے لیے اپنا گھر چھوڑ آئی ہوں۔"

"کیوں چھوڑا تم نے گھر؟" کومل نے اپنے منتشر حواس یکجا کرتے ہوئے خود کو سنبھالا۔

"پاپا میری بات جو نہیں مان رہے تھے۔" اس نے پریشانی سے جواب دیا۔

"تم اب کیا کرو گی؟"

"میں گھر چھوڑ آئی ہوں واپس نہیں جاؤں گی۔ یہ لو میرا بیگ اس میں کپڑے ہیں اور یہ میرا ہینڈ بیگ بھی حفاظت سے رکھ دو اس میں جیولری اور کیش ہے۔"

رنم نے آنکھیں مسلتے ہوئے دونوں چیزیں اس کی طرف بڑھائیں۔ کومل یوں پیچھے ہوئی جیسے بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔

"نہیں رنم تم گھر واپس لوٹ جاؤ میرے مما پاپا فنکشن میں گئے ہیں انہیں پتا چل گیا تو میری شامت آجائے گی۔" کومل سخت خوف زدہ لگ رہی تھی۔ اس نے رنم کے ہاتھوں کی طرف مطلق توجہ نہ دی جن میں سامان دبا تھا۔

"نہیں میں واپس نہیں جاؤں گی مجھے تم اپنے پاس رکھ لو۔" رنم ایسے بولی جیسے کومل انکار نہیں کرے گی۔

"پلیز کومل تم میری دوست ہو۔" وہ روہانسی ہو رہی

تھی۔

"تمہارے پاپا کی اپروچ سے سب واقف ہیں اگر انہیں تمہاری یہاں موجودگی کی خبر ہوگئی تو میری فیملی کی شامت آجائے گی۔ ویسے تم رکنا چاہو تو موسٹ ویلکم، مگر دوسری صورت میں یہ ممکن نہیں ہے۔ میری دوست بن کر تم سو بار آؤ، مگر گھر چھوڑ کر آنے کی صورت میں، میں تم سے معذرت خواہ ہوں۔" اس کا لہجہ بااعتماد اور مضبوط تھا۔

کومل سمجھ دار اور باشعور تھی۔ احمد سیال کے بارے میں ان کی طاقت اور اثر ورسوخ کے بارے میں بھی سب کچھ جانتی تھی۔ اگر انہیں رنم کی یہاں موجودگی کا علم ہوجاتا تو اس کی ذات لازمی شک کی لپیٹ میں آتی۔ وہ مما پاپا کے گھر واپس آنے سے پہلے پہلے رنم کو یہاں سے چلتا کرنا چاہ رہی تھی۔ دوستی اپنی جگہ پر اسے پاپا کی عزت اور سلامتی بھی عزیز تھی۔

رنم پہ پہلے اسے ہمیشہ رشک آتا تھا پر ابھی ترس آرہا تھا۔ اچھی خاصی سر لائف انجوائے کرتے کرتے وہ جانے کیوں یہ حماقت کرنے پہ تل گئی تھی اور گھر چھوڑ کر یہاں پہنچ چکی تھی۔

"دوسری صورت میرے پاس نہیں ہے۔" رنم کا لہجہ تلخ ہورہا تھا۔ کومل نے فوراً" اپنے اندرونی احساسات پہ قابو پایا اور زبردستی کی مسکراہٹ لبوں پہ سجائی۔

"تم ابھی غصے میں ہو کل تک تمہارا غصہ دور ہوجائے گا۔ آج کی رات تم میرے گھر مہمان ہو۔ کل میں اور پاپا تمہارے ساتھ تمہارے گھر جائیں گے اور احمد انکل کو سمجھا کر راضی کرنے کی کوشش کریں گے۔" کومل جیسے اسے لالی پوپ دے کر بہلا رہی تھی۔

"مجھے تمہاری کسی بھی قسم کی ہیلپ کی ضرورت نہیں ہے۔" رنم کا لہجہ یکسر ہی سرد ہوا۔ کومل کی باتوں کے پیچھے چھپے معانی نے اسے ازحد تکلیف پہنچائی تھی۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" کومل روہانسی ہونے لگی۔

"مطلب یہ کہ میں جارہی ہوں یہاں سے۔" رنم نے ہینڈ بیگ اٹھایا اور چھوٹا سا سوٹ کیس اپنی طرف کھسکایا جو اس کے پاؤں کے پاس پڑا تھا۔ کومل کے چہرے پہ خوشی سی آگئی وہ جانے رنم کے جملے سے کیا سمجھی تھی۔

"شکر ہے تمہیں عقل آگئی ہے۔ اپنے گھر سے کوئی ایسے تھوڑی نکلتا ہے۔ پاپا کو راضی کرو جاکر۔ کب تک ناراض رہوگی۔ میری مانو تو واپس جاکر سب سے پہلے سوری کرنا۔" اس نے سکون کا سانس لیا۔

رنم دروازے کی طرف بڑھتے بڑھتے رک گئی اور پلٹی۔

"تمہاری ایڈوائس کا بہت بہت شکریہ۔ مجھے تمہاری فرینڈ شپ پہ بہت ٹرسٹ تھا، لیکن اب No further more۔" یہ طنزیہ فقرہ اس کی دل گرفتی کا مظہر تھا۔ رنم دروازے سے باہر نکلی تو کومل اس کے پیچھے لپکی۔

"رنم تم تو ناراض ہوکر جارہی ہو۔ میرا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا جو تم سمجھی ہو۔" وہ شرمندہ سی تھی۔

"میں اب سمجھ گئی ہوں۔" رنم رکے بغیر بولی۔

"دیکھو میں نے تم سے جو کچھ بھی کہا تمہاری بھلائی کے حوالے سے کہا تم گھر سے ایک رات بھی غائب رہتی تو اسکینڈل بن جاتا۔ میں اس لیے چاہ رہی ہوں کہ تم گھر واپس چلی جاؤ۔ گھر میں اختلافات ہو ہی جاتے ہیں، لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ گھر ہی چھوڑ دیا جائے۔ تم لڑکی ہو گھر سے نکلے ہوئے تمہیں زیادہ دیر بھی نہیں ہوئی ہے انکل کو ابھی پتا بھی نہیں چلا ہوگا۔ مما پاپا گھر نہیں ہیں ورنہ میں تمہیں خود ڈراپ کر آتی۔" کومل ہر ممکن طریقے سے اس کا غصہ اور ناراضی ختم کرنے کی کوشش کررہی تھی۔

"تو تھینکس میں خود چلی جاؤں گی۔" رنم سرد مہری سے بولتی بیرونی گیٹ بھی عبور کرگئی۔ کچھ دیر کومل وہیں کھڑی رہی پھر وہ بھی پلٹ کر گھر کے اندرونی حصے میں آگئی۔ دل میں وہ شکر ادا کررہی تھی کہ رنم بخیرو خوبی واپس چلی گئی ہے۔ مما پاپا کو پتا چلتا تو اس کی کلاس

لیتے کیوں کہ احمد سیال کے اثرورسوخ کا انہیں بھی اچھی طرح علم تھا۔

٭ ٭ ٭
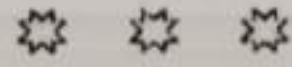
رنم، کومل کے گھر سے نکل آئی تھی اور بیگ تھامے روڈ پر چلی جا رہی تھی۔ رفتہ رفتہ شام ہو رہی تھی۔ اس نے پاس سے گزرتی ایک ٹیکسی کو روکا۔ ڈرائیور کو فراز کے گھر کا پتا سمجھا کر وہ پچھلی سیٹ پہ ڈھیر ہوگئی۔ کومل کے رویے نے اسے سخت صدمے سے دوچار کیا تھا۔

اس نے تو دوستی کا بھی لحاظ نہیں کیا تھا، جھٹ آنکھیں ماتھے پہ رکھ لی تھیں۔ اب ایک دم کیسے بدل گئی تھی۔ رنم کو بہت شدید طریقے سے رونا آرہا تھا پر وہ ٹیکسی میں بیٹھ کر رونا نہیں چاہتی تھی۔ ڈرائیور شوقین مزاج لگتا تھا۔ رنم کے بیٹھتے ہی اس نے میوزک سسٹم آن کر دیا تھا۔ رنم اپنی ٹینشن میں تھی ورنہ اسے ٹوکتی ضرور۔

میں ڈھونڈنے کو زمانے میں جب وفا نکلا
پتا چلا کہ میں لے کے غلط پتا نکلا.....

گلوکار سریلے انداز میں دنیا کی ایک اہم حقیقت بیان کر رہا تھا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی رنم نے سنا اور پھر اس کے ہونٹوں پر تلخ مسکراہٹ آگئی۔ وہ بھی کومل کے پاس کتنی امیدیں لے کر پہنچی تھی۔

فراز اس کا بیسٹ فرینڈ تھا رنم کو اس پہ بے پناہ مان تھا۔ اس لیے اس نے فراز کی طرف جانے کا فیصلہ کیا تھا کیوں کہ فی الحال اس کی آخری امید فراز ہی تھا۔ فراز کے گھر کے سامنے ٹیکسی والے کو اس نے ہزار کا نوٹ دے کر فارغ کیا۔ وہ کبھی اسے دیکھ رہا تھا اور کبھی ہزار کے نیلے نوٹ کو۔

رنم پیسے دے کر آگے بڑھ گئی تھی اس نے نہ کرایہ پوچھا اور نہ باقی پیسے طلب کیے۔ ٹیکسی ڈرائیور اس کی عقل پہ ماتم کرتا اور دریا دلی پہ خوش ہوتا واپس جا چکا تھا۔ رنم کو فراز کا چوکیدار بہت اچھی طرح پہچانتا تھا سو اس نے رنم کو زوردار سلام جھاڑا اور گیٹ کھول دیا۔

اندر ایک اور ملازم نے ڈرائنگ روم تک اس کی رہنمائی کی۔ فراز یہاں اکیلا اپنے ملازمین کے ساتھ رہتا تھا۔ اندرون پنجاب اس کا آبائی گھر اور سینکڑوں ایکڑ زمین تھیں یہاں وہ پڑھائی کے ارادے سے رہ رہا تھا۔ اس کے والد کھاتے پیتے خوشحال زمیندار تھے اس لیے وہ یہاں ٹھاٹھ سے رہ رہا تھا دیکھنے والے اس کی قسمت پہ رشک کرتے تھے۔

فراز کو جیسے ہی ملازم نے رنم کے آنے کی اطلاع دی وہ فوراً" ڈرائنگ روم میں آگیا۔ نظر رنم کے پاس رکھے سوٹ کیس پہ پڑی۔ ہینڈ بیگ اس کی گود میں دھرا تھا۔ ذہین تھا فوراً" تاڑ گیا کہ کہیں نہ کہیں کوئی گڑبڑ ضرور ہے۔

"کیا یہاں رہنے کے ارادہ ہے، جو سوٹ کیس بھی ساتھ لائی ہو۔" اس نے قصداً" ہلکا پھلکا انداز اختیار کیا۔ ادھر فراز کے پوچھنے کی دیر تھی رنم کی آنکھیں برس پڑیں۔ اس نے نئے سرے سے سب کچھ دہرایا۔ کومل کی بے حسی، خود غرضی، طوطا چشمی پہ وہ بے پناہ رنجیدہ تھی۔ فراز اس کی رگ رگ سے واقف تھا اس لیے اس نے کوئی اظہار خیال کرنے کی حماقت نہیں کی۔

"تم کتنی دیر پہلے گھر سے نکلی تھیں۔" فراز کی نگاہیں دیوار گیر کلاک پر مرکوز تھیں۔

"کافی گھنٹے ہوگئے ہیں۔" رنم بڑبڑائی۔

"ابھی تک تمہارے پاپا کو تمہاری گمشدگی کا علم نہیں ہوا ہوگا وہ یہی سمجھ رہے ہوں گے کہ تم فرینڈز کے ساتھ ہو اور تمہارا سیل فون کہاں ہے؟" اسے اچانک خیال آیا۔

"میں آف کر کے گھر رکھ آئی ہوں۔" اس نے فراز سے نظر چراتے ہوئے کہا۔

"اچھا تب ہی ایک گھنٹہ پہلے میں نے تمہیں کال کی تو آف مل رہا تھا۔" فراز نے جیسے خود کلامی کی۔

"فراز میں اب ادھر ہی رہوں گی جب تک پاپا میری بات نہیں مان جاتے تمہیں کومل کی طرح کوئی اعتراض تو نہیں ہے؟" رنم کی آنکھوں میں بے پناہ

اندیشے نظر آرہے تھے۔
"تم جب تک چاہو یہاں رہو۔" اس نے دوستانہ آفر کی تو رنم پہلی بار پرسکون ہو کر مسکرائی۔
"تم سیریس ہو؟" اسے جیسے یقین نہیں آرہا تھا۔
"ہاں میں سچ کہہ رہا ہوں۔ تم اپنا سامان رکھو۔ ملازم کمرا تیار کردے گا۔ میں کہتا ہوں اسے اور جاؤ تھوڑا فریش ہو جاؤ۔" فراز اسے تسلی دے کر اٹھا۔
"سنو مجھے بھوک لگی ہے۔" رنم کو تھوڑا اطمینان ہوا تو بھوک ستانے لگی ویسے بھی اس نے صبح سے کچھ نہیں کھایا تھا۔
"تم ایزی ہو جاؤ میں کھانے کا بول کر آتا ہوں۔"
فراز باہر جا چکا تھا۔ رنم صوفے سے ٹیک لگائے ٹانگیں اوپر کیے نیم دراز تھی اسے نیند آرہی تھی۔ صبح کی جاگی تھی دن بھر کی بے آرام تھی اب پریشانی کچھ کم ہوئی تو جسم آرام طلب کرنے لگا۔ ساتھ بھوک بھی لگ رہی تھی۔ فراز کو گئے کافی دیر ہو چکی تھی۔ رنم اسے دیکھنے کے لیے باہر آئی۔
ٹی وی لاؤنج سے کسی کے بولنے کی آواز آرہی تھی۔ اور یہ سو فیصد فراز ہی تھا۔ وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھی فراز بہت آہستہ آواز میں بات کر رہا تھا۔
"انکل وہ یہاں میرے گھر میں ہے۔ میں نے کافی تسلی دی ہے اسے آپ جلدی آئیں۔ میں فون بند کر رہا ہوں ایسا نہ ہو اسے شک ہو جائے۔" وہ اگرچہ آہستہ آواز میں بول رہا تھا پر بغور کان لگا کر سننے سے حرف حرف رنم کی سماعتوں میں اتر گیا تھا۔ فراز فون بند کر چکا تھا۔
رنم کچھ ثانیے کے لیے جیسے ادھر ہی سن ہو گئی قدموں نے آگے بڑھنے سے انکار کر دیا۔ فراز نے بھی کومل کی طرح اسے دھوکا دیا تھا۔ کتنی بری طرح فراز نے اس کے اعتبار کو توڑا تھا۔ اس کا سب سے بیسٹ فرینڈ اس کی پیٹھ پر چھرا گھونپ چکا تھا۔ یہ وقت افسوس کرنے کا نہیں تھا اسے یہاں سے نکلنا تھا۔ فراز پاپا کو کال کر کے انفارم کر چکا تھا۔ وہ جہاں کہیں بھی تھے انہوں نے فراز کے گھر پہنچ جانا تھا۔ وہ ایک اور نمبر ملا کر بات کر رہا تھا۔ رنم الٹے قدموں چلتی ڈرائنگ روم میں پہنچی۔ وہاں سے سوٹ کیس اور ہینڈ بیگ اٹھایا۔ اس کا کل اثاثہ یہ ہی دو چیزیں تھیں۔ وہ آہستہ قدموں سے چلتی گیٹ تک آئی ورنہ باہر موجود چوکیدار کو شک ہو سکتا تھا۔
پر خیریت رہی۔ گیٹ کے ساتھ رکھی اس کی کرسی خالی تھی۔ وہ شاید کسی ضرورت سے کہیں گیا ہوا تھا۔ وہ تیز تیز چلتی ہوئی روڈ تک آئی۔ اب آہستہ چلنے کا مطلب ناکافی تھا۔ خوش قسمتی سے فوراً" ٹیکسی بھی مل گئی۔ وہ پھرتی سے دروازہ کھول کر بیٹھ گئی۔
"کسی اچھے سے ہوٹل لے چلو مجھے۔" اس نے سوچے سمجھے بغیر کہا۔ اس کے ذہن میں کچھ بھی نہیں تھا۔ کومل اور فراز کو اس نے آزمالیا تھا اب اشعر کو آزمانے کی کوشش فضول تھی وہ اگر راعنہ کے پاس جاتی تو اس نے بھی نصیحتوں کے انبار لگا دینے تھے اور فوراً" سے بھی پیشتر اس کے پاپا کو انفارم کرنا تھا۔ اس لیے رنم نے تھک ہار کر ہوٹل کا سوچا تھا۔ اس کے ذہن میں کوئی بھی لائحہ عمل نہیں تھا حماقت در حماقت کرتی جارہی تھی۔
ٹیکسی ڈرائیور نے بیک مرر سے اس کا جائزہ لیا۔ رنم کوشش کر رہی تھی اس کی کسی حرکت سے پریشانی یا اضطراب کا اظہار نہ ہو۔ ٹیکسی والے نے بہت غور سے اسے سہ بار دیکھا۔ لڑکی شکل و صورت ولب ولہجہ اور لباس سے امیر گھر کی لگ رہی تھی اور جس جگہ سے وہ ٹیکسی رکوا کر بیٹھی تھی وہ علاقہ بھی پوش تھا۔ سو ایسے لوگ کس قسم کے ہوٹلز میں قیام کرتے ہیں ٹیکسی ڈرائیور کو اچھی طرح علم تھا۔ اس نے اپنی ٹیکسی ایک عمدہ مہنگے قسم کے ہوٹل کے سامنے لا کھڑی کی۔

✡ ✡ ✡

ڈرائنگ روم میں کمال اور اس کی والدہ عفت خانم آئی ہوئی تھیں۔ بوا نے شاندار طریقے سے خاطر مدارات کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔
اتوار کا دن تھا۔ عفت خانم بغیر کسی اطلاع کے

اچانک اپنے سپوت کے ساتھ آن وارد ہوئی تھیں۔

زرینہ بیگم کو پتا ہوتا کہ آج انہوں نے آنا ہے تو وہ انہیں منع کر دیتیں۔ کیوں کہ اتوار کے دن وہاب لازمی ان کے گھر آتا تھا اور اچھا خاصا ٹائم گزار کے جاتا۔ وہ زیان کے دیدار کے لیے آتا تھا اور گھنٹوں بیٹھتا تھا۔ کیوں کہ اسے چھٹی کا ایک ہی دن ملتا تھا ویسے بھی وہ درمیان میں گاہے بگاہے چکر لگاتا تھا ہر اتوار کے دن اس کی آمد لازمی ہوتی۔

بوا نے جلدی جلدی میں اچھا خاصا کھانا تیار کر لیا تھا جسے مہمان ڈکار کے ہضم بھی کر چکے تھے۔ اب زرینہ بیگم ان کے ساتھ باتوں میں لگی ہوئی تھیں۔ عفت خانم جواب لینے آئی تھیں کیوں کہ زرینہ بیگم نے امیر علی کی عدم دلچسپی کی وجہ سے ابھی تک انہیں کچھ نہیں کہا تھا اسی لیے آج وہ خود آئی تھیں کچھ کمال کا دباؤ بھی تھا۔

زیان کی خوب صورتی، کم عمری میں ملیح موہنی صورت نے اسے بے صبرا کر دیا تھا اسی کے نتیجے میں وہ اس وقت عفت خانم کے ساتھ امیر علی کے گھر میں بیٹھا ہوا تھا۔ جبکہ زرینہ دل ہی دل میں دعا کر رہی تھیں کہ وہاب آج یہاں کا رخ کرنا بھول جائے۔ پر ہونی ہو کر رہتی ہے وہاب آج خاصا لیٹ آیا جب تک خاص الخاص مہمان پر تکلف لنچ کر کے گپیں ہانک رہے تھے۔

وہاب نے ڈرائنگ روم کے باہر سے ہی جھانکا اندر نہیں گیا اور سیدھا بوا رحمت کے پاس آگیا۔

"بوا کوئی مہمان آئے ہیں کیا؟" اس نے استفسار کیا۔

"ہاں وہاب میاں مہمان آئے ہوئے ہیں۔" بوا نے وہاب کا چہرا غور سے دیکھا۔

"کون سے مہمان ہیں؟" وہ تیزی سے بولا۔

"آپ خود اندر چل کر دیکھ لیں۔ چھوٹی دلہن کے کوئی جاننے والے ہیں۔" بوا نے مصلحت سے کام لیا۔ کیوں کہ اڑتی اڑتی کچھ باتیں ان کے کانوں تک بھی پہنچی تھیں۔ اس لیے انہوں نے وہاب کو زیادہ تفصیل نہیں بتائی۔ پر نہ جانے کیوں اس کا چہرا اندرونی اضطراب کی شدت سے لال ہو رہا تھا۔ بوا مہمانوں کے لیے چائے کے ساتھ دیگر لوازمات رکھ رہی تھیں۔

زیان کے کمرے کا دروازہ حسب معمول حسب توقع بند تھا۔ امیر علی اپنے کمرے میں تھے۔ بوا نے چائے کا کپ اس کے آگے رکھا اس نے چھوا بھی نہیں۔

اندر ڈرائنگ روم سے اونچی آواز میں باتیں کرنے کی آواز آ رہی تھی۔ ہنسی مذاق اور قہقہے بتا رہے تھے جیسے کسی دلچسپ موضوع پہ بات ہو رہی ہو۔ وہاب ٹی وی لاؤنج میں بیٹھ کر زرینہ خالہ کا انتظار کرنے لگا۔ نہ جانے کیوں رہ رہ کر اسے احساس ہو رہا تھا ان مہمانوں کا آنا بے سبب نہیں ہے اور جو سب اس کی سوچ میں آیا تھا اس نے وہاب کے ذہن میں ہلچل مچا دی تھی۔

کچھ دنوں سے وہ نوٹ کر رہا تھا کہ امی اور زرینہ خالہ میں فون پہ لمبی لمبی باتیں ہونے لگی ہیں حالانکہ پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا تھا بہت ہوا تو روبینہ نے فون کر کے زرینہ سے دعا سلام کر لی، خیر خیریت پوچھ لی اور بس' لیکن اب جب وہ آفس سے کبھی امی کی سیل نمبر پہ فون کرتا تو نمبر ہمیشہ مصروف ملتا۔ گھر میں ہوتا تب بھی زرینہ خالہ کی کال وقفے وقفے سے آتی اور روبینہ اپنا فون لے کر ادھر ادھر ہو جاتیں۔ وہاب نے ایک دوبار بے دھیانی میں ان کی یک طرفہ گفتگو سنی تو خدشوں کے ناگ سر سرانے لگے۔ آج وہ اپنے خدشات کی تصدیق کے لیے ہی یہاں آیا تھا اور اسے محسوس ہو رہا تھا اس کے بے نام خدشات بہت جلد حقیقت بن کر اس کے سامنے آنے والے ہیں۔

وہ صبر سے خالہ کا انتظار کر رہا تھا۔ مہمان چائے پینے کے ساتھ ساتھ خوش گپیوں میں بھی مصروف تھے۔ اسے اونچی آوازوں سے کوفت سی ہونے لگی۔ زرینہ خالہ خاصی دیر بعد مہمانوں سے فارغ ہوئیں تب انہوں نے وہاب کو دیکھا۔

"تم کب آئے؟" وہ خاصی پریشان نظر آ رہی تھیں حالانکہ وہاب کو دیکھنے سے پہلے ان کا موڈ بالکل نارمل تھا اب چہرے پہ تفکر نے ڈیرے ڈال لیے تھے۔

کوشش کے باوجود وہ اپنی پریشانی چھپانے میں کامیاب نہیں ہو ئیں۔ وہاب یک ٹک انہیں دیکھ رہا تھا جیسے ان کے تاثرات میں آنکھوں میں کوئی راز چھپا ہو۔

"تم کب آئے وہاب مجھے کسی نے بتایا ہی نہیں۔" وہ گڑبڑا ئیں۔

"مجھے تو آئے ہوئے تین گھنٹے سے اوپر ہو گئے ہیں۔" وہاب کا لہجہ عجیب سا تھا۔

"کوئی چائے وائے پی تم نے؟" زرینہ بیگم اس کی طرف دیکھنے سے احتراز برت رہی تھیں۔

"خالہ یہ کون سے مہمان تھے، میں نے پہلے نہیں دیکھا کبھی۔"

"میرے ملنے والے تھے۔"

"آپ کے سب ملنے والوں کو میں جانتا ہوں۔" وہ سخت لہجہ میں ایک ایک لفظ کو چبا کر بولا تو زرینہ کے تاثرات بھی یکسر بدل گئے۔ اسے کیا ضرورت تھی وہاب سے ڈرنے یا دبنے کی۔

"یہ مہمان ذیان کے رشتے کے لیے آئے تھے۔" زرینہ کے انداز میں فطری اعتماد لوٹ آیا تھا۔

"تو گویا آپ اور امی اتنے دن سے مل کر یہی کھچڑی پکا رہی تھیں۔" وہ زہرخند ہو کر بولا۔

"خالہ آئندہ مجھے یہ مہمان یہاں نظر نہ آئیں۔" وہ انگلی اٹھا کر وارننگ دینے والے انداز میں بولا تو زرینہ کے تلوؤں میں آگ لگی اور سر پہ بجھی گویا۔ ان کا چہرا غصے سے لال انار ہو گیا۔

"تم مجھے یہ حکم دینے والے کون ہوتے ہو۔ میرے گھر کس کو آنا ہے، کس کو نہیں آنا اس کا فیصلہ میں کروں گی نہ کہ تم۔ میں تمہاری مرضی یا حکم کی پابند نہیں۔"

"خالہ یہ لوگ ذیان کے رشتے کے لیے آئے ہیں اس لیے میں نے کہا ہے کہ آئندہ مجھے یہاں نظر نہ آئیں۔"

"ذیان ہماری اولاد ہے۔ یہ ہمارا گھر ہے اور ذیان کی شادی کس کے ساتھ کرنی ہے یا ہونی ہے اس کا فیصلہ بھی ہم نے کرنا ہے تم نے نہیں۔" زرینہ چیخ ہی تو پڑیں، وہاب تھوڑا خائف سا ہو گیا۔ کچھ بھی سہی وہ اس وقت خالہ کے گھر میں تھا اور کچھ کہنے کی پوزیشن میں بھی نہیں تھا۔ اس اچانک صورت حال نے اس کے حواس سلب کر لیے تھے اوپر سے خالہ شیرنی کی مانند اس پہ چڑھ دوڑی تھیں۔

"خالہ آپ کو شاید پتا نہیں ہے میں ذیان کو پسند کرتا ہوں شادی کرنا چاہتا ہوں۔" اس کا انداز اب دفاعی ہو گیا تھا۔

"مجھے اس کا اندازہ نہیں تھا ورنہ کچھ نہ کچھ کرتی۔" زرینہ نے بھی ایک دم پینترا بدلا۔

"کیا مطلب خالہ میں سمجھا نہیں۔"

"مطلب یہ کہ امیر علی کبھی نہیں مانیں گے تمہارے اور ذیان کے رشتے کے لیے۔"

"کیوں خالہ آخر کیوں نہیں مانیں گی وہ؟"

"کیوں کہ وہ میرے خاندان میں اپنی بیٹی کی شادی نہیں کرنا چاہتے۔" زرینہ وہاب کی نرمی اور پسپائی محسوس کر کے شیر ہو گئی تھیں۔

"خالہ آپ امیر خالو سے بات تو کریں بلکہ میں امی کو بھیجوں گا رشتے کے لیے فوراً" پہلے میرا ارادہ کچھ اور تھا پر اب دیر نہیں کروں گا ایسا نہ ہو "ٹور شور" بنانے کے چکر میں سب کچھ ہی میرے ہاتھ سے نکل جائے۔"

"ٹور شور سے تمہارا کیا مطلب ہے؟" وہ وہاب کی بات کی تہ تک پہنچنے کی کوشش کر رہی تھیں۔

"میں کچھ سیونگ کے چکر میں تھا اتنا ہو جائے کہ میں گولڈ کا ایک سیٹ منگنی کے لیے اور شاندار سا سوٹ لے سکوں۔ کسی اچھے ہوٹل میں اپنی منگنی کا فنکشن دھوم دھام سے کروں۔ ذیان کے شایان شان۔" اس نے ٹور شور کی طویل وضاحت کی۔

"میں امی کو جلدی بھیجوں گا آپ کے پاس۔"

"آپا کو میرے پاس رشتے کی نیت سے بھیجنے کی ضرورت نہیں ہے ہم عفت خانم کو ہاں کر چکے ہیں۔" زرینہ نے جھوٹ فراٹے سے بولتے ہوئے اس کے اعتماد کی مضبوط دیوار میں پہلا سوراخ کیا۔ تب زرینہ کو وہاب کے چہرے پہ چٹانوں کا سا عزم نظر آیا۔

"آپ نے صرف رشتے کے لیے ہاں کی ہے نا۔ نکاح تو نہیں ہوا نا۔" وہ عجیب سے انداز میں بولا۔

"شریف خاندانوں میں زبانی رضامندی نکاح سے کم نہیں ہوتی۔" جولیا" وہ ٹھنڈے ٹھار لہجہ میں بولیں۔

"خالہ میں اس وقت جا رہا ہوں بعد میں پوری تیاری کے ساتھ آؤں گا۔" وہاب دروازے کو پاؤں سے ٹھوکر مار کر کھولتے ہوئے عبور کر گیا۔ بوا حیرانی اور ناسمجھی کے عالم میں وہاب کو دیکھ رہی تھیں۔

زرینہ نے اسی وقت زیان کے کمرے کا دروازہ دھڑ دھڑایا۔ اس نے لاک کیا ہوا تھا اور سرمنہ لپیٹ کے لیٹی تھی۔ وہ مہمانوں کی آمد پہ ایک بار بھی باہر نہیں نکلی تھی۔ حالانکہ عفت خانم نے کتنی بار اس کا پوچھا تھا۔ زرینہ نے جھوٹ بول کر انہیں مطمئن کیا تھا۔ زرینہ کو پتا تھا زیان اس کے کہنے کے باوجود بھی کمرے سے نکل کر عفت خانم سے نہیں ملے گی اس لیے انہوں نے ایسی کوشش کی ہی نہیں تھی۔

زیان نے بولٹ گرا کر لاک ہٹا دیا تھا۔ زرینہ تیز قدموں سے آگے اس کی طرف آئی تھیں۔

"تم مہمانوں کے آنے پہ کمرے سے باہر کیوں نہیں نکلیں؟" انہیں زیان پہ شدید غصہ آرہا تھا کیوں کہ وہی تو اس سارے فساد کی جڑ تھی۔

"وہ آپ کے مہمان ہیں اس لیے آپ خود ہی ڈیل کریں۔"

"خیر میں تمہیں یہ بتانے آئی تھی کہ کمال کی والدہ رشتے کی رضامندی کا جواب لینے آئی تھیں۔ تمہارے ابو کو کمال بہت پسند آیا ہے اس لیے تم خود کو ذہنی طور پر کمال سے شادی کے لیے تیار کرلو۔"

"مجھے نہیں کرنی کسی بھی کمال یا جمال سے شادی۔" وہ سرد لہجہ میں بولی۔

"تمہارے ابو کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ ان کے حال پہ رحم کرو۔" زرینہ کا لہجہ کاٹ دار تھا۔

"آپ میرے حال پہ رحم کریں نہیں کرنی مجھے شادی۔" اس بار زیان نے باقاعدہ ہاتھ جوڑ دیے۔

"تمہاری ماں خود عیش کر رہی ہے تمہیں میرے سینے پہ مونگ دلنے کے لیے یہاں چھوڑ گئی ہے۔" زرینہ نے آواز دبا کر ایک ایک لفظ پہ زور دیا۔ یہ زیان کی کمزوری اور دکھتی رگ تھی۔ اس کے چہرے کا رنگ یک دم متغیر ہوا۔ زرینہ دل ہی دل میں خوش ہوئیں۔

"کمال نہیں پسند تو نہ سہی وہاب بھی تمہارے امیدواروں میں شامل ہے۔" انہوں نے تاک کر ایک اور وار کیا۔

"میں لعنت بھیجتی ہوں وہاب پر اور آپ سے وابستہ ہر چیز پہ۔" زیان زہر میں بجھے ہوئے لہجے میں بولی۔ پہلی بار زرینہ نے اس کے اندر سرکشی کو سر اٹھاتے دیکھا۔

"ایسی صورت میں کمال بیسٹ چوائس ہے۔" غصے میں بھی زرینہ نے عقل کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا۔

"آپ کو کمال اتنا ہی پسند ہے تو رابیل یا مناہل میں سے کسی ایک کی شادی اس کے ساتھ کردیں۔" زیان نے یہ مشورہ دے کر گویا بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈال دیا تھا۔

"رابیل یا مناہل کا نام لینے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں ان کی ماں ابھی زندہ ہوں میری بیٹیاں لاوارث نہیں ہیں۔ زبان کاٹ ڈالوں گی جو آئندہ ان کا نام لیا۔ تمہاری ماں کی طرح نہیں ہوں اپنی بچیوں کی بھلائی عزیز ہے مجھے۔"

زیان کا چہرا دھواں دھواں سا ہو گیا۔ زرینہ کا وار نشانے پہ لگا تھا۔ زیان صوفے پہ گرنے والے انداز میں بیٹھ گئی۔ زرینہ کو اس کا شکست خوردہ چہرا دیکھ کر دلی خوشی ہوئی اپنی ماں کا نام لیے جانے پہ اس کی یہی حالت ہوتی تھی۔ زیان کی آنکھوں میں آنسو ڈول رہے تھے۔ زرینہ اسے چھوڑ کر باہر آگئیں۔ اب جو طوفان پیچھے آتا ان کی بلا سے۔ انہیں سروکار نہیں تھا۔

زیان نے وحشیانہ انداز میں تکیے پہ مکے برسائے۔ دیواروں پہ لاتیں ماریں اپنے بال نوچے، لیکن گھٹن

بڑھتی جارہی تھی۔ تھک ہار کر اب وہ گھٹنوں میں سر دیے سسک سسک کر رو رہی تھی۔ اس کی چند ثانیے پہلے والی ساری اکڑ اور تیزی رخصت ہو گئی تھی۔ طوفان آنے کے بعد سناٹے اور خاموشی والی کیفیت تھی۔

☆ ☆ ☆
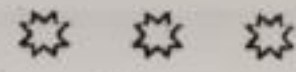
رنم کو گئے کافی دیر ہو چکی تھی۔ کومل اس کے جانے کے بعد کافی دیر بلاوجہ لان کے چکر کاٹتی رہی۔ وہ اسی کے بارے میں مسلسل سوچ رہی تھی۔ جانے گھر پہنچی ہو گی کہ نہیں۔ یہاں سے نکلے ہوئے اسے دو گھنٹے سے اوپر ہو چکے تھے۔ وہ ناراض ہو کر اس سے رخصت ہوئی تھی اسے منانا دشوار امر تھا، لیکن یہ کام تو کرنا ہی تھا۔ کومل نے اسے فون کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے سیل فون اٹھا کر رنم کا نمبر ڈائل کیا۔ پر اس کا نمبر آف جا رہا تھا۔ اس نے تین چار بار ٹرائی کیا، لیکن ہر بار ایک ہی جواب ملا۔

اس نے فراز کا نمبر ڈائل کیا۔ اس وقت کومل کے دل پہ بے پناہ بوجھ تھا وہ فراز سے شیئر کرنا چاہ رہی تھی۔ فراز رنم کا کلوز فرینڈ تھا اسے سمجھا بجھا کر کومل کی طرف سے اس کا دل صاف کر سکتا تھا۔

فراز نے فوراً" فون ریسیو کیا۔ کومل کے بولتے ہی وہ جان گیا کہ وہ اس وقت بہت پریشان ہے۔

"کومل آر یو او کے؟"

"نو ناٹ ایٹ آل۔ فراز رنم اپنا گھر چھوڑ کر میرے پاس آئی تھی، لیکن میں نے سمجھا کر اسے گھر واپس بھیج دیا تھا وہ ناراض ہو کر گئی ہے مجھ سے۔ میں اس کے نمبر پہ کال کر رہی ہوں، لیکن وہ پاور آف ہے۔ تم اس کی ناراضی دور کرنے کی کوشش کرنا ہو سکتا ہے میں کل یونیورسٹی نہ آسکوں، بہت ڈسٹرب ہوں۔" جواب میں فراز نے اسے جو کچھ بتایا وہ کومل کے ہوش اڑانے کے لیے کافی تھا۔

وہ گھر نہیں گئی تھی سیدھی فراز کے پاس آئی تھی اور اب وہاں سے بھی غائب تھی۔ یعنی کومل کے سمجھانے کا اس پہ کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔

"میں اپ سیٹ ہوں بہت۔ میرا خیال ہے اس نے فون پہ میری باتیں سن لی تھیں جو میں احمد انکل کے ساتھ کر رہا تھا۔ گیٹ پہ چوکیدار بھی نہیں تھا جو اسے روکتا یا مجھے انفارم کرتا۔" فراز کی آواز سے اس کی دلی پریشانی کا اندازہ لگایا جا سکتا تھا۔

"فراز وہ کہاں گئی ہے۔ تم نے اس کے گھر سے معلوم کیا؟" کومل کا سوال بہت سے اندیشے سمیٹے ہوئے تھا۔

"ہاں میں نے ابھی ابھی کال کی ہے کسی ملازم نے اٹینڈ کی ہے کال اور بتایا ہے کہ رنم بی بی گھر پہ نہیں ہیں۔"

"اس کا سیل فون بھی آف ہے۔" کومل نے بتایا۔

"سیل فون آف کر کے وہ اپنے گھر ہی چھوڑ آئی ہے۔ اس لیے آف مل رہا ہے۔"

"فراز تم نے احمد انکل کو بتایا اس کے بارے میں؟" کومل نے محتاط ہو کر پوچھا۔

"نہیں میں نے کچھ نہیں بتایا ہے، جب وہ مجھ سے پوچھیں گے۔ تو بتاؤں گا ورنہ نہیں۔"

"فراز وہ مجھ سے بھی تو پوچھیں گے نا۔"

"ڈونٹ وری کومل۔" فراز نے اسے تسلی دی۔

"وہ کہاں ہو گی اب؟"

"مجھے جیسے ہی پتا چلا کہ وہ ڈرائنگ روم میں نہیں ہے تو اسی وقت میں نے اسے پورے گھر میں تلاش کیا۔ ناکامی پہ میں نے اسے ادھر ادھر قریب کے علاقے میں ڈھونڈا۔ ابھی تمہاری کال آنے سے پانچ منٹ پہلے ہی گاڑی پورچ میں کھڑی کر کے آیا ہوں۔" فراز خود بہت پریشان تھا۔

"میں راعنہ سے کال کر کے پوچھتی ہوں اور اشعر سے بھی۔ ہو سکتا ہے وہ ان کی طرف ہو۔" کومل پرامید تھی۔

"اشعر کو میں نے کال کی تھی اس نے لاعلمی کا اظہار کیا ہے۔ باقی میرا نہیں خیال کہ وہ راعنہ کی طرف جا سکتی ہے۔ پھر بھی تم پوچھ لو۔"

فراز کے ساتھ رابطہ منقطع کرکے کومل نے فوراً راعنہ کو کال ملائی۔ فراز کا اندیشہ سچ ثابت ہوا۔ رنم اس کی طرف بھی نہیں تھی۔

☼ ☼ ☼
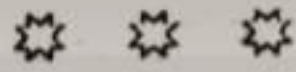
امیر علی کا کمرا ڈرائنگ روم کی مشرقی سمت میں واقع تھا اس لیے گھر کے دیگر حصوں میں ہونے والی سرگرمیوں کی سن گن بہت کم ان تک پہنچ پاتی تھی۔ جب تک کوئی بات مکمل طور پہ ان کے علم میں نہ لائی جاتی وہ آگاہی سے محروم رہتے۔ پر وہاب اور زرینہ کے جھگڑے کی آواز ان کی سماعتوں تک بھی پہنچی تھی اسی لیے انہوں نے زرینہ سے استفسار کیا۔

"یہ وہاب اتنا تیز تیز کیوں چلا رہا تھا؟" دوائی کھاتے کھاتے انہوں نے اچانک سوال کیا۔

"اس کا دماغ خراب ہو رہا ہے اور بس۔" زرینہ نے ٹالنے کی کوشش کی۔

"وہ زیان کا نام بھی لے رہا تھا کیوں؟" اس بار سوالیہ بے بسی ان کے لہجے سے واضح تھی۔

"دراصل میں وہاب کی مرضی ہے زیان سے اس کا رشتہ ہو جائے پر آپا روبینہ ایسا نہیں چاہتیں انہوں نے خاندان کی ہی ایک لڑکی وہاب کے لیے پسند کر رکھی ہے۔ وہ میرے پاس آیا تھا کہ اس کی ماں کو سمجھاؤں۔" زرینہ نے اعتماد سے جھوٹ بولا۔

"یہ میرا گھر ہے کوئی مچھلی بازار نہیں ہے۔ جو وہ اتنا شور شرابا کر کے گیا ہے۔" امیر علی کا انداز بتا رہا تھا کہ انہوں نے بہت کچھ سن لیا ہے۔

"منعفت خانم کو آپ کوئی صاف جواب دے ہی نہیں رہے ہیں زیان کی کشتی جب تک کسی کنارے نہیں لگتی تب تک یہی ہوگا۔ آپ کو کتنی بار کہا کہ کمال کے رشتے کے لیے ہاں کر دیں ورنہ زیان کی ماں کی شہرت کی وجہ سے اس کے ساتھ یہی ہوگا۔"

زرینہ نے ان کے زخموں پہ نمک چھڑکنے میں انتہا کر دی تھی۔ جواباً وہ بے بسی سے انہیں دیکھ کر رہ گئے۔ بہت سال پہلے انہوں نے ذرا سے شک کے پیچھے اپنا گھر اجاڑ کر زرینہ سے شادی رچائی تھی اور اسے ایک ایک کمزوری سے آگاہ کیا۔ زرینہ بیگم تب سے اب تک ان کی کمزوریوں سے کھیلتی آ رہی تھی۔ زیان کی صورت میں ایک جیتا جاگتا کھلونا بھی ان کے پاس تھا۔

"بس کر جاؤ زرینہ بیگم۔ میں نے بہت بڑی غلطی کی تھی۔" امیر علی نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا تھا۔ وہ دور بیٹھی تمسخرانہ نگاہوں سے انہیں دیکھ رہی تھیں۔

☼ ☼ ☼

عنیزہ سونے کے لیے لیٹ چکی تھیں۔ ارسلان مطالعے میں مصروف تھے۔ عنیزہ بستر پہ نیم دراز ہوئیں تو انہوں نے بھی کتاب رکھ دی۔

"کل کے لیے تیاری کرلی ہے نا؟" وہ انہیں سوالیہ نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔

"جی ہاں سب تیاری مکمل ہے۔" وہ آنکھیں موندے موندے بولیں۔ ان کے چہرے پہ تھکن تھی۔ شاید دن بھر کی مصروفیت کا نتیجہ تھا۔ صبح انہیں اپنے کام کے سلسلے میں دوسرے شہر جانا تھا اور قیام ہوٹل میں تھا۔

ارسلان ادبی ذوق کے مالک تھے وقتاً فوقتاً وہ شہر میں ہونے والی ادبی سرگرمیوں میں شرکت کرتے رہتے تھے۔ تقاریب کے دعوت نامے آئے دن ملتے۔ ان دونوں یعنی ملک ارسلان اور عنیزہ نے کچھ روز کے لیے گاؤں سے باہر جانے کا پروگرام بنایا تھا۔ عنیزہ ویسے بھی ادبی سرگرمیوں اور دلچسپیوں میں ان کے ساتھ ہی ہوتی تھیں۔

ملک ایبک کو ان دونوں کے ہوٹل میں قیام پہ اعتراض تھا کیوں کہ شہر میں ان کا عالیشان گھر موجود تھا۔ پر ہوٹل میں قیام کرنا ان کی مجبوری تھی۔ کیوں کہ وہ جس ادبی تقریب میں شرکت کرنے جا رہے تھے وہ اسی ہوٹل میں منعقد ہونی تھی اس لیے ملک ارسلان نے وہاں قیام کو اولیت دی تھی کیوں کہ تقریب میں ان

کے پسندیدہ شعرا بھی مدعو تھے۔ ایک سے انہوں نے معذرت کرلی تھی۔

اولاد سے محرومی کے دکھ کو ان دونوں میاں بیوی نے اپنی اپنی مصروفیات میں بھلانے کی کوشش کی تھی اور اس میں کافی کامیاب بھی تھے۔ اس بار شہر آنے کا فیصلہ انہوں نے عنیزہ کی ذہنی صحت کے پیش نظر کیا تھا کیوں کہ انہیں بار بار ڈپریشن کے دورے پڑنے لگے تھے۔

وہ ماضی کی بھول بھلیوں میں گم ہو رہی تھیں۔ ماضی جو ہمیشہ سے ان دونوں کے لیے اذیت ناک رہا تھا۔ ملک ایبک اسے ماضی کے عمیق غاروں سے نکالنا چاہ رہے تھے اور اس میں کافی کامیاب بھی رہے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ عنیزہ کل شہر جانے کے تصور سے خوش تھیں۔

☼ ☼ ☼
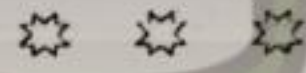
احمد سیال پاگلوں کی طرح رنم کو تلاش کرتے پھر رہے تھے۔

رات گئے انہوں نے باری باری رنم کے سب دوستوں کو کال کرکے اس کے بارے میں پوچھا۔ فراز نے سچائی سے سب حالات ان کے گوش گزار کردیے تھے۔ وہ خود چل کر فراز کے پاس آئے تھے۔ کومل کی زبانی رنم کی بابت سن کر وہ ڈھے سے گئے۔

فراز کو ساتھ لے کر انہوں نے رنم کی سب سہیلیوں، دوستوں سے اس کے بارے میں پوچھا۔ بدنامی کے ڈر سے وہ اس بات کو پھیلانے سے ڈر رہے تھے ان کے دوست احباب رنم کی گمشدگی سے واقف ہوجاتے تو کتنی باتیں بنتیں انہیں اپنی عزت اور خودداری عزیز تھی۔ اس لیے خاموشی سے انہوں نے رنم کی تلاش کے لیے ممکنہ جگہیں دیکھ ڈالیں۔ وہ کہیں بھی نہیں تھی اور کوئی ایسا ثبوت بھی نہیں تھا جس کی بنا پر وہ اسے اغوا شدہ گردانتے۔ وہ خود اپنی مرضی سے گھر چھوڑ کر گئی تھی جو گم ہوجاتے ہیں انہیں تلاش کیا جاسکتا ہے پر وہ جو اپنی مرضی سے گئی تھی احمد سیال

اسے کہاں تلاش کرتے اس نے کوئی سراغ نہیں چھوڑا تھا۔ فراز کے مشورے پہ انہوں نے احتیاطاً رنم کی گمشدگی کی رپورٹ پولیس میں درج کروادی تھی۔

فراز نے ان کی بہت مدد کی تھی ہر جگہ رنم کو تلاش کرنے کی مہم میں وہ احمد سیال کے ساتھ ساتھ رہا تھا۔ رنم کی پراسرار گمشدگی احمد سیال کے ساتھ ساتھ باقی ان سب دوستوں کے لیے بھی معمہ بنی ہوئی تھی۔

طویل سیاہ رات گزر چکی تھی۔ سپیدہ سحر اندھیری رات کا سینہ چیرتے ہوئے نمودار ہونے کی فکر میں تھا۔ احمد سیال پوری رات میں ایک لمحے کے لیے بھی نہیں سوپائے تھے۔ انہیں ایسے لگ رہا تھا جیسے وہ شدید کرب کے حصار میں ہیں ان کی یہ جان کنی کی کیفیت ختم ہونے والی نہیں تھی۔ ان کی رنم گھر پہ نہیں تھی۔ وہ اپنے گھر تھے پر ان کی لاڈلی بیٹی نے کہاں اور کیسے رات گزاری تھی وہ اس سے لاعلم تھے۔

محض ایک رات میں ہی وہ برسوں کے بیمار نظر آرہے تھے۔ چوڑے کندھے جھک گئے تھے چہرے پہ زردی کھنڈی تھی۔ انہوں نے پولیس میں رپورٹ درج کروادی تھی۔ ان کا دوست ایس پی گوندل خود رنم کی گمشدگی سے متعلق معاملات کو دیکھ رہا تھا پر ابھی تک اس کی طرف سے بھی کوئی حوصلہ کن خبر نہیں ملی تھی۔

رنم کو اگر خبر ہوجاتی کہ احمد سیال کس کرب اور اذیت سے گزر رہے ہیں تو ایسے گھر چھوڑ کر جانے سے پہلے یقیناً" وہ بہت بار سوچتی۔ رات سے انہوں نے کھانے کے نام پہ پانی کے چند گھونٹ ہی پیے تھے۔

☼ ☼ ☼

رنم کو ہوٹل میں کمرا لینے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ ہوٹل بہت اچھا تھا۔ کمرا بھی اس کی پسند کے مطابق تھا پر اندر اندر ہی کوئی چیز رہ رہ کر پریشان کررہی تھی۔ ہوٹل میں رنم کا تیسرا دن تھا۔ اس دوران وہ ایک بار بھی اپنے کمرے سے باہر نہیں

نکلی۔ تینوں وقت ناشتا چائے پانی کھانا کمرے میں ہی منگواتی۔ ہوٹل کے کچھ ملازم اور بیرے اس کی طرف سے نامعلوم تجسس کا شکار ہو رہے تھے۔ نہ وہ کہیں گئی تھی نہ اسے کوئی ملنے آیا تھا۔ اس شاندار سہولیات سے مزین ہوٹل میں اس نے پورے ایک ماہ کے لیے کمرا بک کروایا تھا۔

سامان کے نام پہ اس کے پاس صرف چھوٹا سا ایک سوٹ کیس اور ہینڈ بیگ تھا اور سب سے حیرت انگیز بات اس کے پاس سیل فون بھی نہیں تھا۔ صفائی کرنے والے لڑکے نے نظر بچا کر اس کے سامان اور کمرے کی سرسری سی تلاشی لی تھی۔

ہوٹل میں لوگ آتے جاتے رہتے ہیں کسی کا قیام مختصر اور کسی کا طویل ہوتا ہے پر رنم کی طرف سے ہوٹل اسٹاف کے کچھ لوگ تجسس کا شکار ہو رہے تھے۔ لڑکی خوب صورت اور اونچے گھرانے کی لگ رہی تھی صاحب حیثیت بھی تھی تب ہی تو اس مہنگے ہوٹل میں آکر ٹھہری تھی۔ ورنہ عام انسان تو یہاں کی ایک چائے کی پیالی بھی افورڈ نہ کر سکتا تھا۔

رنم کے پاس پیسے تیزی سے کم ہو رہے تھے۔ وہ ہینڈ بیگ میں موجود سب چیزیں باہر نکال نکال کے دیکھ رہی تھی۔ بظاہر سب چیزیں پوری تھیں پھر بھی کہیں نہ کہیں کسی کمی کا احساس ہو رہا تھا۔ رنم ہینڈ بیگ میں موجود چیزیں اندر ڈال کر نقد پیسے گن رہی تھی جب دروازے پہ ہلکی آواز میں دستک ہوئی۔

"یس کم ان۔" اس نے مصروف انداز میں کہا خود وہ اپنے کام میں لگی رہی۔ اسے کھانا پہنچانے والا بیرا دبے قدموں اندر داخل ہوا۔ وہ رنم کی پشت پہ کھڑا تھا۔ آہٹ پہ وہ چونک کر سیدھی ہوئی اور بیرے کو دیکھ کر بڑبڑاتے ہوئے پیسے اور دیگر چیزیں سب تکیے کے نیچے کر دیں۔ پر اس کے چھپانے سے پہلے ہی وہ سب کچھ دیکھ چکا تھا۔

بیرے کے ہاتھ میں کھانے کی ٹرے تھی۔ اس نے اپنے تاثرات سے ذرا بھی ظاہر نہ ہونے دیا کہ وہ سب دیکھ چکا ہے۔ اس نے کھانے کی ٹرے ٹیبل پہ رکھی اور ادب سے سلام کر کے باہر آ گیا۔ بیرے نے اسے پیسے گنتے دیکھا تھا پر ساتھ ہی اس نے ہینڈ بیگ سے باہر رہ جانے والے سونے کی زیورات بھی رنم کی لاپروائی کی وجہ سے دیکھ لیے تھے۔ اسے پوری امید تھی کہ لڑکی کے پاس اور بھی بہت کچھ ہو گا کیوں کہ وہ موٹی آسامی لگ رہی تھی۔

اس کی نیت میں فتور آ چکا تھا۔ لڑکی جوان اور خوب صورت تھی سونے پہ سہاگا اکیلی تھی ابھی تک تو اس نے لڑکی کے ساتھ کسی کو بھی نہیں دیکھا تھا نہ اس نے کسی سے رابطہ کیا تھا۔ یعنی دوسرے الفاظ میں وہ اس کے لیے آسان ترین شکار ثابت ہو سکتی تھی۔ اس لیے رنم کو کھانا پہنچا کر واپس جاتے ہوئے اسے اپنے منصوبے کے بارے میں سوچتے ہوئے سرور آ رہا تھا۔

☆ ☆ ☆
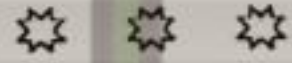
کمرے میں بند رہ رہ کر رنم اکتا گئی تھی۔ ڈرتے ڈرتے اس نے پہلی بار کمرے سے باہر قدم رکھا۔ اس نے بیرے کو پہلے ہی کھانا لانے سے منع کر دیا تھا۔ وہ آزاد فضا میں تھوڑی دیر بیٹھ کر اپنے مسائل کا حل سوچنا چاہ رہی تھی سب سے بڑا مسئلہ تو تیزی سے ختم ہوتی ہوئی رقم کا تھا۔

اس نے گھر سے نکلنے سے پہلے گنے بغیر پیسے بیگ میں ڈالے تھے اچھی خاصی رقم تھی، لیکن اسے گننے کے بعد کم لگ رہی تھی۔ اس کی فکر اپنی جگہ تھی، لیکن ابھی اس کے پاس اچھی خاصی مالیت کے زیورات بھی تھے جو اس کی ذاتی ملکیت تھی۔ کریڈٹ کارڈ اور اے ٹی ایم کارڈ اس کے علاوہ تھے۔ اس کے باوجود بھی وہ پریشان تھی۔ شاید اسے پیش آنے والی تلخ حقیقتوں کا کچھ کچھ اندازہ ہو رہا تھا ایک ثانیے کے لیے اس کے جی میں آئی کہ گھر واپس چلی جائے، لیکن فوراً ہی اس نے اپنے اس خیال کا گلا مضبوطی سے گھونٹ دیا۔ وہ احمد سیال سے بہت شدید ناراض تھی۔

کھانا ویٹر نے سرو کر دیا تھا پر اس نے کھانے کو آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔

اسی ڈائننگ ہال میں اور بہت سے لوگوں کے ساتھ عنیزہ بھی تھیں۔ عنیزہ کی نظر کھانے کے دوران اچانک رنم پہ پڑی۔ سب ہی کھانا کھا رہے تھے پر شکل سے اداس اور پریشان نظر آنے والی لڑکی کھانے کی طرف بالکل بھی متوجہ نہیں تھی۔ کھانے کو سامنے رکھے وہ غیر مرئی نکتے کو دیکھ رہی تھی۔ عنیزہ کو اپنے بائیں پہلو میں شدید چبھن کا احساس ہوا۔ کرب کی ایک لہر پورے وجود میں ایک ثانیے کے لیے بے دار ہوئی۔ دل اس اجنبی لڑکی کی طرف کسی معصوم بچے کی مانند ہمک رہا تھا۔ اپنی اس کیفیت سے وہ خود بھی حیران تھیں۔ لڑکی کے چہرے کی اداسی دیکھ کر اس کا اپنا دل گہری اداسی میں ڈوب گیا تھا۔ بہت ضبط کے باوجود جب عنیزہ سے رہا نہیں گیا تو وہ اٹھ کر اس کی ٹیبل کی طرف آگئیں۔ جو اب بھی خوف زدہ ہرنی کی مانند ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں کسی خوف کے گہرے سائے صاف دکھائی دے رہے تھے۔

"کیا میں یہاں آپ کے پاس بیٹھ سکتی ہوں؟" عنیزہ کی نرم شائستہ آواز پہ وہ چونک کر ان کی طرف متوجہ ہوئی۔ اب اس کے چہرے پہ خوف کے سایوں کی جگہ ایک رسمی مسکراہٹ نظر آرہی تھی پر اس میں بھی ہزاروں سوال اور خدشے تھے۔ جانے یہ کون تھیں اور کیوں اس کے پاس آئی تھیں۔

"پلیز بیٹھیے۔" عنیزہ کا لہجہ لباس اور شکل و صورت ہر گز بھی نظر انداز کیے جانے کے قابل نہ تھی تب ہی رنم نے انہیں بیٹھنے کی آفر کی۔ وہ ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ شکریہ ادا کرتے ہوئے بیٹھ گئیں۔

اگلے دس منٹ میں رنم ان کے ساتھ کافی اطمینان سے باتیں کر رہی تھی۔ ملک ارسلان اپنے ایک شاعر دوست کے ساتھ کسی ادیب سے ملنے گئے ہوئے تھے۔ انہوں نے عنیزہ کو بھی ساتھ چلنے کی آفر کی تھی پر انہوں نے نرمی سے منع کر دیا۔ تب ہی تو وہ یہاں اکیلے کھانے کھا رہی تھیں۔

ملک ارسلان کی ساتھ نہ جانے کی صورت میں ہی تو ان کی ملاقات نمناں نامی اپنی اپنی سی لگنے والی لڑکی سے ہوئی تھی۔ ایک لحاظ سے اچھا ہی ہوا تھا ورنہ وہ اسے کیسے ملتیں۔ دل کی اس بے اختیار کیفیت پہ وہ خود بھی حیران تھیں۔

نمناں اپنے کمرے میں جا چکی تھی۔ عنیزہ نے اسے اپنا کانٹیکٹ نمبر دیا تھا اور ہوٹل کے روم کے بارے میں بھی بتایا تھا۔ رنم نے انہیں اپنا نام نمناں بتایا تھا۔ عنیزہ نے اسے کافی ساری باتیں کی تھیں۔ سوال پوچھے تھے پر وہ صفائی سے ٹال گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

ملک ارسلان رات کو کافی لیٹ ہوٹل واپس آئے۔ عنیزہ بے تابی سے ان کا انتظار کر رہی تھیں۔ محبوب بیوی کے چہرے پر دبا دبا جوش انہیں ایک نظر ڈالتے ہی محسوس ہو گیا تھا۔ وہ بہت خوش نظر آرہی تھی۔ وہ نمناں کے بارے میں بات کر رہی تھیں۔ ملک ارسلان ان کی اس قدر دلچسپی محسوس کر کے خود بھی پوری توجہ سے سن رہے تھے۔

"جانے کیا بات ہے پہلی ہی نظر میں وہ مجھے اپنی اپنی سی لگی ہے۔ کچھ پریشان اور کھوئی کھوئی سی تھی میں نے بہت پوچھا پر اس نے بتایا نہیں۔"

"تو کل پوچھ لینا۔" ارسلان نے مسکراتے ہوئے مشورہ دیا۔

"ہاں میں نے اسے اپنا سیل نمبر بھی نوٹ کروایا ہے اور روم نمبر بھی بتایا ہے۔" عنیزہ فوراً بولیں۔

"تو ہماری بیگم کو وہ لڑکی بہت پسند آگئی ہے۔" ملک ارسلان محبت بھری نگاہوں سے انہیں دیکھ رہے تھے۔

"اسے دیکھ کر مجھے بہت کچھ یاد آگیا ہے۔ یہاں پہلو میں چبھن ہو رہی ہے۔" عنیزہ اچانک سنجیدہ ہو گئیں۔ ان کا مسکراہٹ سے مزین روشن چہرا اور جوت دیتی نگاہیں بجھ سی گئی ہیں۔ ملک ارسلان اچھی طرح جانتے تھے اب کیا ہو گا کیونکہ عنیزہ ان کی طرف سے کروٹ بدل کر لیٹ گئی تھیں۔ بظاہر آنکھیں بند

کیسے سو رہی تھیں مگر حقیقت میں ایسا نہیں تھا۔

آج کی شب ان پہ بہت بھاری تھی۔ انہوں نے خیالوں ہی خیالوں میں ماضی کا تکلیف دہ سفر طے کرنا تھا۔ اس کے اختتام پہ ان کا درد اور بھی بڑھ جاتا تھا۔ یہ برسوں سے ہو رہا تھا لیکن ابھی تک اس اذیت ناک سفر کا پہلا پڑاؤ ہی ختم ہونے میں نہیں آرہا تھا۔ ملک ارسلان ان کی اذیت اور درد سے واقف ہونے کے باوجود انجان بنے ہوئے تھے وہ نہیں چاہتے تھے عنیزہ کا بھرم ٹوٹے۔

☆ ☆ ☆
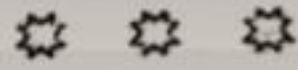
بدحواسی میں رنم نے پورا بیگ چھان مارا تھا۔ ایک ایک چیز باہر نکال کر دیکھی۔ نہ جیولری تھی نہ ہی کریڈٹ کارڈز۔ صرف اے ٹی ایم کارڈز پڑے اس کا منہ چڑا رہے تھے۔ اس نے موہوم سی امید کے سہارے دوسرا بیگ کھولا کہ شاید اس نے سب چیزیں بے دھیانی میں وہاں رکھ دی ہوں پر وہاں تو صرف استعمال کے کپڑے اور دیگر اشیاء تھیں۔

اس کا جی چاہ رہا تھا دھاڑیں مار مار کے روئے۔ اب اس کے پاس پھوٹی کوڑی تک نہ تھی۔ وہ صرف ایک بار رات کو کھانے کھانے دوسرے الفاظ میں اندرونی گھٹن اور خلفشار سے پیچھا چھڑانے کے لیے کمرے سے باہر گئی تھی۔ اس دوران سب کچھ صفائی سے پار کیا گیا تھا۔ اس بات کا اسے سو فی صد یقین تھا۔

یہ حادثہ اس کے ساتھ رات کو ہوا تھا۔ اب دوپہر ہو چلی تھی۔ وہ صدمے کی حالت میں بیٹھی تھی۔ دوپہر سے شام ہو گئی۔ وہ باہر نہیں نکلی۔ روم سروس کی طرف سے کھانا آیا اس نے دروازہ ہی نہیں کھولا۔ اس کی حالت ابتر ہو رہی تھی۔

رات سر پہ تھی۔ ایک بار پھر دروازے پہ دستک ہوئی۔ اس نے خود کو سنبھالتے ہوئے دروازہ کھولا۔ بیرا کھانا لایا تھا۔ رنم نے پیچھے ہٹ کر اسے اندر آنے کا راستہ دیا۔ خود وہ دروازے کے پاس کھڑی تھی کہ بیرا جائے تو وہ دروازہ اندر سے لاک کرے۔ پر وہ کھانے کی ٹرے رکھ کر اسی طرح کھڑا رنم کو دیکھ رہا تھا۔

"آپ پریشان لگ رہی ہیں۔ کوئی پرابلم ہے بتائیں۔" ہوٹل کا معمولی سا ملازم بڑے معنی خیز انداز میں پوچھ رہا تھا جیسے رنم کا وہ بڑا ہمدرد رہی ہو۔

"تم سے مطلب جاؤ یہاں سے۔" رنم کا فطری غصہ عود کر آیا۔

"میں آپ کے بہت کام آسکتا ہوں۔ صرف ایک موقع دیں مجھے۔ مجھے سب معلوم ہے آپ اکیلی ہیں، پریشان ہیں۔ آپ کے پاس کچھ نہیں ہے۔ میں آپ کے سب مسئلے حل کر سکتا ہوں۔ اگر آپ۔۔۔" رنم کے غصے کے باوجود اس نے اپنی بات جاری رکھی۔ اس کے ادھورے فقرے کا مفہوم وہ اچھی طرح جان گئی تھی۔

"یہاں سے فوراً" نکل جاؤ" میں مینجر سے تمہاری شکایت کروں گی۔" وہ اسے کھلے لہجے میں دھمکی دے رہی تھی۔ ہوٹل کے اس ملازم کو اس کی مجبوری اور کمزوری کا احساس تھا' تب ہی تو ڈھٹائی سے کھڑا مسکرا رہا تھا۔

"میں رات کام ختم کر کے آؤں گا۔ میری بات مانو گی تو فائدے میں رہو گی۔ ویسے مجھے تم گھر سے بھاگی ہوئی لگتی ہو۔ تمہارا عاشق عیش کرنے کے بعد تمہیں چھوڑ گیا ہے اور تم اب مشکل میں ہو۔ اکیلی لڑکی ہو سب ہوٹل اسٹاف کی نگاہوں میں آگئی ہو۔ چند دن کی بات ہے' سب نے تمہیں بہتی گنگا سمجھ کر ہاتھ دھونے ہیں۔ اس لیے بہتری اسی میں ہے کہ مجھ سے سیٹنگ کر لو۔ فائدے میں بھی رہو گی اور سب سے بچ بھی جاؤ گی۔ اچھی طرح سوچ لو۔ ورنہ تم جیسی اکیلی لڑکی کو مار کر غائب کر دینا کوئی بڑی بات نہیں ہے۔"

وہ انسانی نفسیات کا ماہر لگ رہا تھا۔ رنم کے چہرے کے اتار چڑھاؤ سے بہت کچھ بھانپ گیا تھا۔ رنم بالکل سن ہو گئی تھی۔ وہ مسکراتا ہوا چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد رنم نے دروازہ بند کیا اور بیگ میں ہاتھ مار کر اپنا سیل فون ڈھونڈا۔ وہ ہوتا تو ملتا۔ اسے یاد آیا وہ اپنا سیل فون تو آف کر کے اپنے بیڈ روم میں ہی چھوڑ آئی تھی۔

وہ اس وقت کو پچھتا رہی تھی جب سیل فون گھر چھوڑ کر نکلی تھی۔

اس کے دل میں اچانک ہی خیال آیا تھا کہ وہ اپنے گھر فون کرے۔ پاپا کو سب کچھ بتا دے اور پھر دیکھے کہ وہ کیسے ان ہوٹل والوں کی ایسی کی تیسی کرتے ہیں۔ مگر اس کے پاس فون نہیں تھا پیسے بھی نہیں تھے' پر وہ ہوٹل کے ریسپشن سے تو فون کر سکتی ہے۔ اس خیال نے اس کے قدموں میں تیزی بھر دی۔ اگلے پانچ منٹ میں وہ ہوٹل کے ریسپشن پہ موجود تھی۔ وہاں پہ اس وقت ہوٹل اسٹاف کے تین نوجوان کھڑے تھے۔ تینوں نے اسے معنی خیز نگاہوں سے دیکھا۔

اس نے بے ربط ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں مدعا بیان کیا تو ایک آدمی کی مسکراہٹ گہری ہوگی۔ گویا اس کے کمرے میں کھانا سرو کرنے والے بیرے نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ وہ اس کے سب ساتھیوں کی نظروں میں آگئی ہے۔ ایک نے جیسے اس کی غیر ہوتی حالت پہ ترس کھاتے فون اس کی طرف کھسکایا۔ وہ ریسیور اٹھائے خالی الذہنی کے عالم میں پاپا کا نمبر یاد کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ لیکن اسے نمبر یاد نہیں آرہا تھا۔ حالانکہ پاپا کا نمبر اسے ازبر تھا۔ اس نے تین چار پاپا کا نمبر یاد کر کے ڈائل کرنے کی کوشش کی' پر اسے ناکامی ہوئی۔ اس ناکامی پہ اس کی حالت غیر ہو رہی تھی۔ اچانک اسے یاد آیا وہ فکسڈ لائن نمبر پہ بھی تو کال کر سکتی ہے۔ اسے نمبر یاد تھا۔ اس نے تیزی سے نمبر پش کیے۔

بیل جا رہی تھی۔ بہت دیر بعد کال ریسیو ہوئی۔ کسی نے زور سے ہیلو کہا۔ بس منظر سے رونے' پیٹنے' آہ و بکا کی دلدوز آوازیں آرہی تھیں۔ اس کے دل نے ایک بیٹ مس کر دی۔ نہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔ اس کے پاپا کو کچھ نہیں ہو سکتا۔ اس کی زبان جیسے ہلنے سے انکاری تھی۔ اس کی متغیر ہوتی رنگت اور لرزتا کانپتا جسم دیکھ کر ایک نوجوان نے فون کا ریسیور اس سے لے لیا۔

وہ خود بات کر رہا تھا۔ شاید اسے رنم کی حالت پہ ترس آگیا تھا۔ ایک منٹ بعد اس نے فون بند کیا تو اس کی آنکھوں اور لہجہ میں ہمدردی تھی۔ دوسرے دو نوجوانوں کی نسبت اس نے مہذب رویے کا مظاہرہ کیا۔

"آپ نے جس نمبر پہ کال کی ہے' اس گھر کے مالک کا آج انتقال ہو گیا ہے۔" اس نے پگھلا سیسہ رنم کے کانوں میں انڈیلا۔

وہ بہت مشکل سے خود کو کمرے تک واپس لائی اور بستر پہ گر سی گئی۔ صدمات کا پہاڑ ٹوٹ پڑا تھا۔ یہ سب کیا ہو رہا تھا' اس کا برا وقت آگیا تھا۔ جیولری' نقدی سب کچھ پراسرار طور پہ غائب ہو چکا تھا۔ وہ ہوٹل اسٹاف کی نگاہوں میں تھی۔ سب رال ٹپکانے کو تیار بیٹھے تھے اور اب پاپا بھی اسے چھوڑ کر جا چکے تھے۔ وہ تو گھر واپس آنے کے لیے انہیں کال کرنے گئی تھی۔ واپسی پہ دل پہ بھاری صدمے کا بوجھ اٹھائے لوٹی۔ اب اس کی عزت اور جان خطرے میں تھی۔ اسے اپنے بچاؤ کا راستہ تلاش کرنا تھا۔

اچانک اسے عنیزہ ملک کا خیال آیا۔ انہوں نے اسے اپنا فون نمبر دیا تھا اور روم نمبر بھی بتایا تھا۔ وہ سیکنڈ فلور روم نمبر 26 میں ٹھہری ہوئی تھیں۔ پاپا تو رہے نہیں تھے۔ اب وہ گھر کس منہ سے جاتی۔ کاش وہ گھر نہ چھوڑتی' کاش وہ ان کی بات مان لیتی۔ منہ پہ پانی کے چھپاکے مارتی وہ زار و قطار روتی جا رہی تھی۔ وہ عنیزہ ملک کے پاس جانے کے لیے تیار تھی۔ اس وقت اس کے پاس اور کوئی بھی راستہ نہیں بچا تھا۔

اپنے اس گھر میں کیسے جاتی' جہاں اب پاپا نہیں رہے تھے۔ سب نے اسے پاپا کا قاتل ٹھہرانا تھا۔ اس کی ضد تھی کہ وہ ان سے کچھ نہیں لے گی' تو یہ دربدری و محرومی کی سزا اس کے لیے بالکل جائز تھی۔ روم نمبر 26 کے سامنے کھڑے دروازہ ناک کرتے وہ اپنے پاپا کے بارے میں ہی سوچے جا رہی تھی۔

تیسری دستک پہ دروازہ کھل گیا۔ اندر عنیزہ کے ساتھ ملک ارسلان بھی تھے۔ وہ بجلی کی تیزی سے اندر آئی۔

"پلیز۔۔۔ ہیلپ می۔۔۔" وہ عنیزہ ملک کے ہاتھ پکڑ

کر بکھرے ہوئے لہجہ میں بولی۔ آنسوؤں کی برسات اس کی آنکھوں سے جاری تھی۔ وہ دونوں پریشانی سے اسے دیکھ رہے تھے۔ نہ جانے یہ ستم رسیدہ حرماں نصیب کون تھی۔ کون سا دکھ پہنچا تھا اسے جو اس کی آنکھیں ساون بھادوں کا منظر پیش کر رہی تھی۔ روتے روتے وہ بول رہی تھی اور بار بار اس کی آواز ڈوب رہی تھی جیسے بولنے کی طاقت ختم ہو گئی ہو۔

اس کے ٹوٹے پھوٹے الفاظ کا لب لباب کچھ یوں تھا کہ ہینڈ بیگ میں سے اس کی سب چیزیں غائب ہو گئی ہیں۔ والدین حیات نہیں ہیں۔ وہ اکیلی ہے۔ وہ اتفاقی طور پہ ایک حادثے کا شکار ہو کر اس ہوٹل میں پہنچی ہے۔ اس کی جمع پونجی پہ کسی نے ہاتھ صاف کر دیا ہے اور اب اسے اپنی جان اور عزت کی طرف سے شدید خطرہ ہے۔

وہ جس طرح رو رہی تھی جس ابتر حالت میں تھی۔ اس پہ کسی طور بھی یہ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ وہ جھوٹ بول رہی ہے۔ اس کی من موہنی معصوم صورت دھوکا دینے والی نہیں لگ رہی تھی۔ ملک ارسلان نے عنیزہ کو اشارہ کیا کہ رنم کو بٹھائے، تسلی دے، خود بخود ہی ان کے دل میں نرم گوشہ پیدا ہو۔ عنیزہ نے گلاس میں پانی ڈال کر زبردستی اسے پلایا۔

"میں مینجر سے خود بات کرتا ہوں۔" ملک ارسلان نے اسے تسلی دی۔

"نہیں اس کی ضرورت نہیں ہے۔ میں سب کچھ گنوا چکی ہوں۔ اب عزت نہیں گنوانا چاہتی۔" اس بار ہچکیوں سے اس کا سارا جسم لرز رہا تھا۔ عنیزہ کی اپنی آنکھیں نم ہو رہی تھیں۔ اس اجنبی لڑکی کے لیے وہ اپنے دل میں بے پناہ محبت محسوس کر رہی تھیں۔ اس کا دکھ انہیں اپنا دکھ لگ رہا تھا۔ "اب تم کیا کرو گی؟" عنیزہ نے اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھا۔

"میں بے سہارا ہوں، بے آسرا ہوں، اتنی طاقت نہیں ہے کہ کچھ کر سکوں۔" آنسو مسلسل اس کی آنکھوں سے بہے جا رہے تھے۔ عنیزہ نے ارسلان کو اشارہ کیا۔ دونوں رنم کو کمرے میں چھوڑ کر باہر آ گئے۔

جانے کیا بات تھی کہ رنم کا دل چاہ رہا تھا ان پہ اعتبار کر لے۔ یہ ہی وجہ تھی کہ جب وہ دونوں اسے کمرے میں اکیلا چھوڑ کر باہر نکلے تو اسے ان کی نیت پہ کوئی شک نہ ہوا۔

عنیزہ ملک ارسلان سے رنم کے بارے میں بات کرنا چاہ رہی تھیں۔ اسی لیے دونوں ہوٹل کے ایک الگ تھلگ گوشے میں آ گئے، جہاں چہل پہل کافی کم تھی۔ "یہ لڑکی بہت دکھی اور ستم رسیدہ لگتی ہے، ہے بھی اکیلی، اب کیا کرنا ہے اس کا، ہم سے کتنی امیدیں لے کر مدد مانگنے آئی ہے۔" عنیزہ نے بات کا آغاز کیا۔

"میں اپنے ایک دوست کو کال کرتا ہوں۔ پولیس ڈیپارٹمنٹ میں اعلا عہدے پہ ہے۔ اس لڑکی کو بحفاظت دارالامان پہنچا دے گا یا بے سہارا عورتوں کے محفوظ مرکز میں۔"

"اس کی شکل و صورت دیکھی ہے آپ نے۔ میں نے بے سہارا عورتوں کے مرکز کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا ہے۔ میں اس حق میں نہیں ہوں کہ یہ دکھی لڑکی وہاں جائے۔"

"تو پھر تم ہی بتاؤ کیا، کیا جائے؟" وہ سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھنے لگے۔

"نہ جانے کیا بات ہے، یہ لڑکی چند گھنٹوں میں ہی مجھے اپنی اپنی محسوس ہونے لگی ہے۔ ایک بات کہوں، اگر آپ برا نہ مانیں تو۔۔۔" وہ ہزاروں امیدیں لیے ملک ارسلان کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

"ہاں بولو تو سہی۔ پہلے تم نے کبھی ایسے اجازت لینے کا تکلف نہیں کیا بات کرنے کے لیے تو پھر اب یہ غیروں والی باتیں کر رہی ہو۔"

"ملک صاحب بات ایسی ہے کہ کرنے سے پہلے سو مرتبہ سوچنا پڑتا ہے۔"

"ہاں بولو تو اب۔۔۔"

"ملک صاحب اگر ہم اس لڑکی کو ساتھ لے جائیں تو؟" عنیزہ نے ڈرتے ڈرتے کہا تو وہ سوچ میں ڈوب گئے۔

"ویسے لینے کو تو ساتھ لے جاؤں پر سوچ لو۔" کچھ

توقف کے بعد وہ گویا ہوئے۔ "جوان ہے۔ خوب صورت ہے کسی اچھے خاندان کی لگتی ہے۔ ہماری حویلی میں بہت جگہ ہے رہ لے گی۔ ساتھ اسے حویلی میں ہی کسی کام پہ لگادیں گے۔" عنیزہ نے ملک ارسلان کو اور سوچنے کا موقع نہیں دیا۔

"بھائی جان کو اعتراض نہ ہو اس پہ۔" ملک ارسلان نے اس طرف توجہ دلائی تو چند لمحوں کے لیے وہ بھی سوچ میں پڑ گئیں۔

"میں ان سے خود بات کروں گی۔ ویسے بھی یہ ہماری طرف رہے گی۔ بے چاری سی لڑکی ہی تو ہے کوئی نہیں ہے اس کا۔ ثواب ہو گا ہمیں اگر تحفظ دیا اس کو تو اور اللہ بھی خوش ہو گا۔" عنیزہ نے انہیں خاموش دیکھ کر جذبہ ہمدردی ابھارنے کی کوشش کی۔

"میں صرف اسے اس لیے اپنے ساتھ لے کر جا رہا ہوں کہ تم اس عمل سے خوش ہو گی۔" ملک ارسلان محبت سے بولے تو حد درجہ انڈر اسٹینڈنگ کے اس مظاہرے پہ عنیزہ کی آنکھیں بھر سی آئیں۔ وہ تو اپنی طرف سے انہیں کنوینس کرنے کی کوشش کر رہی تھیں، جبکہ وہ ان کے دل کی بات جان گئے تھے۔ "بعد میں جو ہوا میں دیکھ لوں گا۔" "تم ابھی سے پریشان مت ہو۔ انہوں نے اسے تسلی دی تو عنیزہ کھل کے مسکرائیں۔ یہ جگہ اظہار ممنونیت کے لیے موزوں نہیں تھی، ورنہ وہ شاید فرط جذبات سے رو ہی تو پڑتیں۔

☼ ☼ ☼
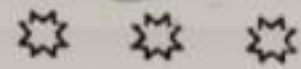
قیامت در قیامت تھی۔ ملک جہانگیر، احمد سیال کے پاس آئے ہوئے تھے۔ کھانے کے بعد چائے کا دور چلا۔ جہانگیر اپنے دوست احمد سیال کو کچھ اپ سیٹ سا دیکھ رہے تھے۔ چائے پینے کے بعد وہ فارغ ہوئے تو ملک جہانگیر نے اپنی آمد کی غرض و غائیت بیان کی۔

"میں نے تم سے اپنے بڑے بیٹے کے رشتے کی بات کی تھی۔ اتنے دن گزر گئے ہیں تم نے کوئی جواب ہی نہیں دیا۔ میں نے سوچا تم سے مل بھی لوں اور اس تاخیر کا سبب بھی دریافت کروں۔" ملک جہانگیر ہلکے پھلکے انداز میں بولے۔ احمد سیال معذرت خواہانہ انداز میں مسکرائے۔

"میں کچھ دیر میں خود گاؤں تمہاری طرف آنے والا تھا۔" اتنا بول کر وہ خاموش ہو گئے۔ ملک جہانگیر ان کے مزید بولنے کے منتظر تھے۔

میری بیٹی رنم اعلا تعلیم کے حصول کے لیے کینیڈا چلی گئی ہے۔ وہ ابھی شادی نہیں کرنا چاہتی، اس لیے میں تم سے معذرت خواہ ہوں۔" وہ بہت دیر بعد آہستہ آہستہ گویا ہوئے۔ جہانگیر کے سینے سے ایک ٹھنڈی سانس خارج ہوئی۔ تو احمد سیال کی پریشانی کی وجہ یہ تھی، اس لیے وہ شرمندہ نظر آ رہا تھا۔

"اس میں معذرت والی کوئی بات ہی نہیں ہے۔ نہ تمہیں اس پہ کوئی شرمندگی ہونی چاہیے۔" جہانگیر نے احمد سیال کے کندھے پہ دوستانہ انداز میں ہاتھ رکھتے ہوئے گویا انہیں تسلی دینے کی کوشش کی۔ لیکن خود اندر سے وہ بددل ہو چکے تھے۔ وہ جلد از جلد ملک ایبک کی شادی کے چکر میں تھے اور احمد سیال سے دوستی کو رشتے داری میں بدلنے کے خواہاں تھے۔ یہ امید تو ختم ہی تھی۔ احمد سیال کی لاڈلی اکلوتی بیٹی اعلا تعلیم کے حصول کی خاطر کینیڈا جا چکی تھی اور بے چارا احمد سیال شرمندہ نادم ان کے سامنے بیٹھا تھا۔

"ہم دوست ہیں اور ہمیشہ رہیں گے کیا ہوا جو ہماری دوستی رشتہ داری میں نہ بدل سکی۔" ملک جہانگیر سے احمد سیال کی مسلسل خاموشی برداشت نہیں ہو رہی تھی۔

"ہاں ہاں تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ لیکن یقین جانو میں بہت شرمندہ ہوں۔ اس لیے اتنے دن گزرنے کے باوجود میری ہمت نہیں ہوئی کہ تم سے بات کروں۔" لیکن میں تمہارا شکر گزار ہوں جو تم نے میری مجبوری کو سمجھا۔

"یار اب بس بھی کرو۔ میں شرمندہ ہو رہا ہوں اب۔" جہانگیر نے قصداً" مزاحیہ انداز اختیار کیا اور واقعی کچھ دیر بعد احمد سیال بظاہر نارمل ہو کر ان سے

بات کر رہے تھے۔

ملک جہانگیر جا چکے تھے، پر احمد سیال اور بھی پریشان تھے۔ رنم کی پراسرار گمشدگی نے ان کی ذہنی و نفسیاتی کیفیت کو بھی متاثر کیا تھا۔ وہ اپنے مالی معاملات دفتری امور کسی پہ بھی توجہ نہیں دے پا رہے تھے۔ ان کا ذہنی دباؤ بڑھتا جا رہا تھا۔ انہیں لاڈلی بیٹی کی ناراضی کا سبب معلوم تھا۔

وہ ان لڑکیوں میں سے نہیں تھی جو ایک شخص کی محبت کی خاطر والدین کی محبتوں سے منہ موڑ کر گھر کی دہلیز پار کر جاتی ہیں۔ بلکہ رنم نے ایک احمقانہ ضد کی خاطر غصے میں آکر یہ انتہائی قدم اٹھایا تھا۔ اگر وہ کسی کو پسند کرتی محبت کرتی تو احمد سیال کو اس کی بات ماننے میں تامل نہ ہوتا، وہ تو ان کی ہستی کی بنیادیں تک ہلا گئی تھی۔ اب وہ پچھتا رہے تھے کہ پہلی بار ہی اس کی بات تسلیم کرلی ہوتی بہلا دیا ہوتا بیٹی کو۔

وہ رنم کے سب دوستوں خاص طور پہ فراز اور کومل کو روز ہی فون کرتے کہ شاید اس نے ان سے رابطہ کیا ہو یا اس کی کوئی خیر خبر مل جائے۔ فراز نے اپنے طور پہ بہت کوشش کی تھی۔ اس کا سراغ لگانے کی۔ پولیس نے الگ اپنی کارکردگی دکھانے کی کوشش کی تھی۔ یہ سب کام رازداری سے ہوئے تھے، کیونکہ احمد سیال کی شرط ہی یہ ہی تھی کہ رنم کی گمشدگی کا پتا نہیں چلنا چاہیے۔ غالباً" اسی رازدار والی شرط کے سبب رنم کی گمشدگی معمہ بنی ہوئی تھی۔

☼ ☼ ☼

ملک ارسلان اور عنیزہ ہوٹل سے چیک آؤٹ کر رہے تھے۔ رنم سخت خوف زدہ تھی۔ ان حالات میں جب ان دونوں نے اسے اپنے ساتھ چلنے کی پیش کش کی تو اسے یوں محسوس ہوا جیسے یہ امداد غیبی ہو۔ اس نے ان کی یہ پیش کش فوراً" قبول کرلی۔

عنیزہ اس کے پہنے گئے کپڑوں کو تنقیدی نگاہوں سے دیکھ رہی تھیں۔ ان کی حویلی کے حساب سے یہ قطعی ناموزوں تھے۔ اس لیے ہوٹل چھوڑنے سے پہلے انہوں نے اس کے لیے کچھ ضروری خریداری کی۔ ہوٹل کے پاس ہی شاپنگ مال تھا انہوں نے رنم کو بھی ساتھ چلنے کی پیش کش کی، پر اس نے انکار کر دیا۔

عنیزہ اس کے لیے کپڑے، جوتے اور استعمال کی کچھ اور چیزوں کی خریداری مکمل کر کے واپس آئیں تو ملک ارسلان گاؤں روانگی کے لیے تیار تھے۔ عنیزہ نے خریدے گئے کپڑوں میں سے ایک سوٹ رنم کی طرف بڑھایا۔

"نہناں تم یہ پہن کر جلدی سے تیار ہو جاؤ اور بال بھی باندھ لو۔" عنیزہ نے تنقیدی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

رنم خاموشی سے کپڑے لے کر چلی گئی۔ یہ امبرائیڈری والی قمیص ٹراؤزر اور ساتھ ہم رنگ دوپٹا تھا۔ اسٹیپس میں کٹے بالوں کو اس نے بمشکل تمام پنیں لگا کر سمیٹا اور پھر پونی باندھی۔ اب اس کی ظاہری شکل و صورت اور حلیہ کافی تبدیل ہو چکا تھا۔ عنیزہ نے دیکھا تو مطمئن ہو گئیں۔

رات کو انہوں نے رنم سے کافی باتیں کی تھیں۔ اپنے خاندان گاؤں اور حویلی کے بارے میں معلومات دی تھیں۔ رنم کو انہوں نے اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ حویلی میں کیسے رہنا ہے اور کسی کے پوچھنے پہ کیا جواب دینا ہے۔ رنم نے ان کو اپنا فرضی نام نہناں بتایا تھا۔ اس لیے جب وہ دونوں اسے نہناں کہہ کر مخاطب کرتے تو وہ ایک ثانیے کے لیے چونک سی جاتی۔ شکر ہے انہوں نے اس پہ توجہ نہیں دی تھی۔

رنم نے دوپٹا اچھی طرح اپنے سر پہ جمایا، وہ دوپٹا سر پہ لینے کی عادی نہیں تھی۔ چونکہ جیسی ڈریسنگ وہ کرتی تھی اس میں دوپٹا لینے کی گنجائش نہیں تھی۔ اس لیے دوپٹا سر پہ لینے میں اسے ازحد مشکل پیش آرہی تھی۔ عنیزہ نے دوپٹا اس کے سر پہ اوڑھا کر ایک سائیڈ پہ پن لگا دی تھی۔ ان کی اس حکمت عملی سے رنم بار بار دوپٹا سنبھالنے کی زحمت سے بچ گئی تھی۔

وہ ملک ارسلان اور عنیزہ کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ

گئی تھی۔ ایک نئی منزل کی طرف اس کا سفر شروع ہو چکا تھا۔ گاڑی شہر سے نکل کر گاؤں والے راستے پہ رواں دواں تھی۔ رنم شیشے کی طرف چہرہ کیے باہر دیکھ رہی تھی۔ سڑک کے دونوں اطراف سرسبز کھیت اور بلند وبالا درخت ایستادہ تھے۔ کہیں کہیں کچے مکانات بھی نظر آرہے تھے۔ تیز دھوپ' سبز چراگاہوں میں مویشی چرتے نظر آرہے تھے۔ عورتیں کھیتوں میں کام کررہی تھیں۔

یہ سب مناظر رنم کے لیے بالکل نئے اور انوکھے تھے۔ شیشے سے باہر کا نظارہ کرتے ہوئے وہ کچھ دیر کے لیے وقتی طور پہ اپنے سب دکھ بھول گئی تھی۔ یہاں کا ماحول اور فضا شہر سے بالکل ہی اچھوتا اور مختلف نظر آرہا تھا۔

☆☆☆
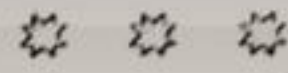
وہاب' روبینہ پہ گرج برس رہا تھا۔ "آپ دونوں مل کر کون کون سے منصوبے تیار کرتی رہی ہیں' سب پتا چل گیا ہے مجھے۔"

"کیا پتا چل گیا ہے تمہیں؟" روبینہ نے پریشانی سے اس کی شکل دیکھی۔

"سنا ہے زرینہ خالہ نے زیان کا رشتہ طے کردیا ہے؟" ان کے چہرے پہ نظر جمائے وہ لفظ چبا چبا کے بول رہا تھا۔

"ہاں اگر اس نے طے کردیا ہے تو زیان اس کی بیٹی ہے۔" انہوں نے لہجہ کو سرسری رکھنے کی پوری کوشش کی تھی۔

"امی میں نے آپ سے پہلے ہی کہا تھا کہ میں زیان سے شادی کرنا چاہتا ہوں' آپ خالہ سے بات کریں۔"

"میں نے اسے ایک بار نہیں' بہت بار بات کی۔ امیر بھائی نہیں مانتے۔" انہوں نے بیٹے سے نظر چرائی۔

"سب جھوٹ ہے' بکواس ہے۔ زرینہ خالہ نے تمام عمر زیان سے نفرت کی ہے۔ وہ کبھی نہیں چاہیں گی کہ میری شادی اس کے ساتھ ہو۔" روبینہ نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا۔ گویا وہ اتنا بھی انجان نہیں تھا جتنا وہ تصور کرتی تھیں۔

"میں نے بہت بار زرینہ سے بات کی ہے' پر وہ نہیں مانتی۔" وہاب کی محبت میں انہوں نے ایک اہم راز سے پردہ اٹھایا تھا۔ اس کا شک وہاب کو پہلے سے ہی تھا' پر اب یہ شک یقین میں بدل چکا تھا کہ خالہ اس کی اور زیان کی شادی ہونے کے حق میں نہیں ہیں۔

"زرینہ خالہ خود کو بہت ہوشیار سمجھتی ہیں نا۔ ان کی ہوشیاری میں ان ہی کے اوپر آزماؤں گا اب۔" وہاب کے ہونٹوں پہ پراسرار مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

"کیا کرنا چاہتے ہو تم؟" روبینہ متوحش ہوئیں۔

"میں نے نہیں کرنا' آپ نے کرنا ہے۔" وہ اسی مسکراہٹ سمیت بولا۔

"کیا کرنا ہے مجھے بتاؤ تو سہی وہاب کیا پہیلیاں بجھوا رہے ہو۔"

"امی آپ نے میرے اور زیان کے رشتے کی بات امیر خالو سے کرنی ہے اور بس۔" وہ دوٹوک لہجہ میں بولا۔

"اور جو کمال کا رشتہ آیا ہے زیان کے لیے وہ۔"

"اس کی آپ فکر مت کریں۔ میں نے کمال کا حل بھی سوچ لیا ہے۔"

"میں نے زرینہ کو کتنا سمجھایا کہ زیان کا رشتہ میرے وہاب کے لیے دے دو' پر اس کی ایک ہی ضد تھی۔ سچ پوچھو تو مجھے کبھی کبھی زیان پہ بہت ترس آتا ہے۔ مجھے تم دونوں کی شادی پہ کوئی اعتراض نہیں ہے۔"

بیٹے کی محبت میں وہ اس وقت زرینہ کی دی ہوئی سب ہدایات بھول گئی تھیں۔ یہ اولاد کی محبت ایسی ہی ہوتی ہے کہ باقی سب رشتوں کو پس پشت ڈال دیتی ہے۔

"امی آپ مجھے پہلے بتادیتی نا تو اب تک میری شادی زیان کے ساتھ ہو چکی ہوتی۔ میں زرینہ خالہ کو ان کے

منصوبے میں کامیاب نہیں ہونے دوں گا۔" رفتہ رفتہ اس کے چہرے پہ غصہ جگہ لے رہا تھا۔

"تم فکر مت کرو' میں بہت جلد امیر بھائی سے تمہارے رشتے کی بات کرنے جاؤں گی۔ زرینہ کو برا لگتا ہے تو لگے' میں بیٹے کی خوشی کو قربان نہیں کر سکتی۔"

ان حالات میں وہ ایک روایتی ماں نظر آرہی تھیں۔ جو اولاد کی خوشی کے لیے کچھ بھی کر سکتی ہے۔

☼ ☼ ☼
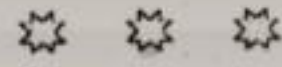
امیر علی کی طبیعت اچانک بگڑی تھی۔ ان کے ناک' منہ سے خون آنا شروع ہو گیا تھا۔ زرینہ کے دل کو خون دیکھ کر کچھ ہوا۔ اس نے پوری قوت سے چیخ ماری اور دروازہ کھول کر اندھا دھند ڈرائیور کے کوارٹر کی طرف بھاگی۔ زیان' بوا' آفاق' مناہل' رابیل تینوں امیر علی کے کمرے میں تھے۔ ان کی حالت لحہ بہ لحہ بگڑتی جارہی تھی۔

زیان بے اختیار ان کی طرف بڑھی۔ ان کی آنکھیں بند تھیں۔ شروع میں وہ بے چین تھے۔ ہاتھ پیخ رہے تھے۔ گردن کو ہلا رہے تھے۔ پر اب ان کی حرکات ست تھیں۔ ڈرائیور انہیں ہسپتال لے جانے کے لیے تیار تھا۔ زیان ان سے بہت کچھ کہنا چاہ رہی تھی' پر ان کی حالت ایسی نہیں تھی۔

وہ ان کے ساتھ اسپتال جانا چاہ رہی تھی' اس لیے بھاگ کر پہلے گاڑی میں بیٹھی۔ زرینہ اور اس کا دکھ مشترک ہو گیا تھا۔ اس لیے انہوں نے زیان کے ساتھ اسپتال جانے پہ کوئی اعتراض نہیں کیا۔

☼ ☼ ☼
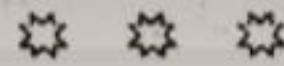
روبینہ نے امیر علی کے پاس جانے کی تمام تر تیاری مکمل کرلی تھی۔ وہاب انواع واقسام کے ڈرائی فروٹس اور پھلوں کے ٹوکرے لایا تھا۔ آخر کو وہ اکلوتے بیٹے کی ماں تھیں۔ وہاب نے کہا تھا کہ کسی بھی قسم کی کوئی کمی نہیں ہونی چاہیے۔ وہاب کی خوشی پہ وہ زرینہ کی ناراضی بھی قربان کرنے کے لیے تیار تھیں۔ انہیں اندازہ تھا کہ زرینہ ان کے اس اقدام سے بہت ناراض ہو گی۔ ان کی بلا سے ناراض ہوتی ہے' تو ہو۔

زیان میں کوئی کمی تو نہیں ہے' خوب صورت ہے' تعلیم یافتہ ہے' آج کل کی لڑکیوں والی چھل بھل اس میں نہیں ہے' کم گو ہے اور سب سے بڑھ کر وہاب کی پسند ہے۔ زرینہ نے برسوں کی نفرت ابھی تک دل میں دبا کر رکھی ہے۔ وہ اسے سمجھانے کا ارادہ رکھتی تھیں۔ زرینہ مان جاتی ہے تو ٹھیک ہے' ورنہ انہیں زیان اور وہاب کی شادی سے مطلب ہے۔ وہ جاتے ہوئے تمام راستہ اسی بارے میں سوچتی رہیں۔

زرینہ کے گھر کے گیٹ سے وہ اندر داخل ہوئیں تو کسی غیر معمولی تبدیلی کا احساس ہوا۔ خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ ورنہ جب بھی وہ آتیں۔ ایک چہل پہل کا احساس ہوتا تھا مگر ابھی سب پریشان بیٹھے تھے' بوا رحمت تسبیح تھامے مسلسل کچھ پڑھ رہی تھیں مناہل' رابیل اور آفاق تینوں اداس اور خاموش تھے۔

زرینہ اور زیان دونوں کہیں نظر نہیں آرہی تھیں۔ انہیں درست طور پہ صورت حال کی سنگینی کا احساس ہوا۔

"بوا کیا ہوا ہے گھر میں اتنی خاموشی کیوں ہے۔ زرینہ اور زیان کہاں ہیں؟" انہوں نے ایک ہی سانس میں پوچھ ڈالا۔

"امیر میاں کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے ناک منہ سے مسلسل خون آرہا تھا۔ پہلے گھر پہ ڈاکٹر کو بلوایا اس نے کہا دیر مت کرو ان کو فوراً" اسپتال لے جاؤ۔ زیان اور چھوٹی دلہن ادھر ہی گئی ہیں۔"

بوا نے تسبیح سائیڈ پر رکھتے ہوئے ان کے سوالوں کے جواب دیے تو ان کے خدشات میں کئی گنا اضافہ ہو گیا۔ بوا کا چہرہ ستا ہوا تھا۔ وہ کافی دیر روتی رہی تھیں۔ ان کے اس گھر اور مکینوں کے ساتھ پرانی وابستگی تھی یہی وجہ تھی کہ وہ ہر دکھ سکھ میں برابر کی شریک ہوتیں۔

روبینہ نے وضو کر کے بوا سے قرآن مانگا۔ انہوں نے حکم کی تعمیل کی۔ روبینہ دوپٹا سر پہ جمائے قرآن

پڑھنے میں مصروف ہوگئیں۔ دل کسی انہونی کے خدشے سے لرز رہا تھا۔ آخر کو زرینہ ان کی ماں جائی تھی۔ اور امیر علی اس کے سر کے سائیں۔ "اللہ میری بہن کا سہاگ سلامت رکھنا" قرآن پڑھ کر انہوں نے دل سے دعا کی۔

بوا نے دوبارہ ہاسپٹل زیان کو کال کر کے امیر علی کی خیر خبر لی تھی۔ زیان کے لہجہ میں مایوسی تھی آواز بھی روئی روئی لگ رہی تھی۔

روبینہ قرآن پڑھنے کے بعد وہیں اس جگہ بیٹھی ہوئی تھیں۔ بوا بھی ان کے پاس تھیں وہ امیر علی کی طبیعت اور موجودہ حالت کے بارے میں ہی بات کر رہی تھیں جب گیٹ پر باہر ایمبولینس سائرن بجاتی رکی تھی۔ روبینہ کو ایسے محسوس ہوا جیسے وقت رک گیا ہو۔ زرینہ کے اونچی آواز میں رونے بین کرنے کی آواز یہاں تک آ رہی تھی۔ باہر بہت سے اور لوگوں کی بھی آوازیں تھیں لیکن ان سب پہ زرینہ کی آواز حاوی تھی۔ روتی کرلاتی' بین کرتی صدمے سے چور چور آواز۔ جیسے اس کا سب کچھ لٹ گیا ہو۔ واقعی اس کا تو سب کچھ لٹ گیا تھا۔ وہ امیر علی کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے گنوا بیٹھی تھیں۔ بیوی سے بیوہ بن کر ہسپتال سے گھر لوٹی تھیں۔

روبینہ نے سینے پہ دو ہتھڑ مارے اور باہر صحن کی طرف بھاگی۔ امیر علی کو ایمبولینس سے اتار کر گھر کے اندر لایا جا رہا تھا۔

زرینہ کے رونے پیٹنے بین کرنے نے سب کو اس کی طرف متوجہ کر دیا تھا۔ پر زیان کی ناگفتہ بہ حالت کی طرف کسی کی بھی توجہ نہیں تھی۔ وہ خاموشی سے خالی الذہنی کے عالم میں سب کی طرف دیکھے جا رہی تھی۔ جیسے اسے کچھ سمجھ ہی نہ آ رہا ہو۔ اس کے سب آنسو دل پہ اندر ہی اندر گر رہے تھے اور ان آنسوؤں نے بہت دور تک آگ لگا دی تھی۔

امیر علی سفید کفن اوڑھے اس سے، بہت دور جا چکے تھے۔ وہ ان سے اپنے دل کی بہت سی باتیں کرنا چاہتی تھی۔ جو وہ اسے پہلے اپنی ناراضی میں ان سے کر نہیں پائی تھی۔ وہ انہیں زرینہ آنٹی کی زیادتیوں کے متعلق آگاہ کرنا چاہتی تھی وہ انہیں رابیل منال اور آفاق کی بیگانگی سے مطلع کرنا چاہتی تھی وہ انہیں یہ سب کھول کھول کے بتانا چاہ رہی تھی کہ زرینہ آنٹی ان کی چہیتی بیوی نے بچپن سے ہی اس کے ساتھ زیادتیاں روا رکھی ہیں وہ اسے ذہنی طور پر بے پناہ اذیت سے دوچار کرتی رہی ہیں۔ انہوں نے اس کے بچپن کو مسخ کر دیا ہے۔ وہ اس کی ماں کے حوالے سے گندی و گری ہوئی گھٹیا باتیں کرتی رہی ہیں۔ حالانکہ اس نے اپنی ماں کو نہیں دیکھا تھا نہ وہ ان کے لمس سے واقف تھی۔

زرینہ آنٹی نے اس کے اور ابو کے درمیان دوری پیدا کر دی ہے۔ حالانکہ اس کا دل چاہتا ہے وہ ان کے پاس بیٹھے ان سے لاڈ کرے ان سے چھوٹی چھوٹی باتیں کرے۔ اس کے سینے میں دبی چھوٹی چھوٹی سی خواہشیں حسرت بن گئی ہے۔ وہ چاہ کر بھی ان کے قریب نہ آ سکی۔ اور وہ ان کے سینے سے لگ کر ان کے ہاتھوں کو پکڑ کر یہ شکایت کرنا چاہتی ہے کہ آپ بھی تو مجھ سے دور ہو گئے آپ بھی تو مجھ سے لاپروا ہو گئے آپ کو پتا ہی نہیں کہ یہاں اس گھر میں آپ کی بیٹی زیان بھی رہتی ہے۔ اسے بھی آپ کی محبت کی شفقت پدری کی ضرورت ہے۔ وہ آپ کی لاپروائی کی وجہ سے آپ سے دور ہوئی ہے۔ حالانکہ وہ آپ کے پاس آنے کے لیے ترستی ہے۔ اس کی سب ناراضی آپ سے ختم ہو گئی ہے۔ وہ اب دل سے آپ سے راضی ہے۔ آپ ایک بار آنکھیں کھول کر اسے دیکھیں تو سہی۔ آپ دیکھیں ناں آپ کی بیماری کی وجہ سے وہ کتنی خوفزدہ رہتی ہے وہ تحفظ چاہتی ہے کیونکہ وہاب کی نیت ٹھیک نہیں ہے۔ وہاں یہاں گھر آتا ہے تو اسے ڈر لگتا ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ آپ اس کا ماتھا چومیں اور کہیں کہ میں تمہارے ساتھ ہوں کسی گندی نگاہ کو تمہاری طرف اٹھنے سے پہلے ہی پھوڑ ڈالوں گا۔

پر امیر علی تو اس کی کوئی خاموش فریاد نہیں سن رہے تھے۔ وہ ان کی زندگی میں بھی ان سے کچھ نہیں کہہ پائی اور کٹی کٹی رہی اور اب موت جیسی اٹل حقیقت نے

رشتوں کی ڈوری ہی کاٹ دی تھی۔

☆ ☆ ☆

سفید حویلی جس میں نہناں یعنی رنم 'ملک ارسلان اور عنیزہ کے ہمراہ آئی تھی بہت شاندار تھی۔ اپنی پریشانی کے باوجود وہ حویلی کی خوب صورتی' سجاوٹ اور وقار دیکھ کر دنگ رہ گئی تھی۔ حویلی کے ساتھ خوب صورت باغ بھی تھا۔ جس میں نایاب اقسام کے پودے اور درخت اپنی بہار دکھا رہے تھے۔

عنیزہ نے رنم کو نوکرانیوں والے حصے میں نہیں ٹھہرایا تھا بلکہ حویلی کے رہائشی حصے میں بنے کمروں میں سے ایک اس کے لیے مخصوص کردیا تھا۔ یہ فرق صاف ظاہر کررہا تھا کہ رنم کو اس نے خاص اہمیت اور حیثیت دی ہے۔ رنم کی رہائش کا انتظام ہوگیا تھا اس کے بعد عنیزہ نے حویلی کے تمام ملازمین سے متعارف کروایا اور سب سے آخر میں وہ اسے افشاں بیگم سے ملوانے لائیں۔

افشاں بیگم کو نہناں یعنی رنم کی بے چارگی و درد ماندگی کا سن کر بہت دکھ ہوا۔ وہ اس کے لیے دل میں ہمدردی محسوس کررہی تھیں۔

عنیزہ اسے پوری حویلی دکھا کر سب کا تعارف کرواچکی تھیں۔ شروع میں رنم بہت خوفزدہ اور سہمی ہوئی تھی اب اس کا خوف آہستہ آہستہ تحلیل ہورہا تھا۔ حویلی میں ملک ارسلان اور عنیزہ بیگم ہی تھے اور باقی ڈھیر سارے ملازمین۔

ملک ارسلان صبح ناشتے کے بعد ڈیرے کی طرف نکل جاتے گھر میں عنیزہ ہوتیں ملازموں کے ہمراہ۔ رنم کے ذمے کوئی خاص کام نہیں تھا اور فارغ بیٹھ بیٹھ کر وہ حقیقی معنوں میں اکتاگئی تھی اس کی اسی اکتاہٹ کے سبب عنیزہ نے حویلی کے ملازمین کی سپرویژن کا کام اسے سونپ دیا۔ یعنی ایک لحاظ سے وہ سب کی انچارج تھی۔ رنم نے یہ کام یا اس نوعیت کے دیگر امور کبھی بھی سرانجام نہیں دیئے تھے اس لیے یہ مصروفیت اس کے لیے غنیمت تھی۔

عنیزہ فارغ اوقات میں حویلی کے دوسرے حصے میں مقیم ملک جہانگیر اور افشاں بیگم کی طرف چلی جاتیں رنم فارغ ہوتی تو وہ اسے بھی ساتھ لے لیتیں۔ لیکن اکثراوقات وہ ان کے ساتھ جانے سے معذرت کرلیتی۔ عنیزہ اس سے بہت خوش تھیں۔ انہیں ایسے محسوس ہوتا تھا نہناں نے آکر ان کی ایک عرصے کی تنہائی کا مداوا کردیا ہے۔ وہ نہناں سے چھوٹی چھوٹی باتیں کرتیں شام کی چائے اکثر اس کے ساتھ پیتیں۔ یعنی وہ ان کے لیے خاص تھی۔

حویلی کے دیگر ملازمین بھی عنیزہ کی اس کے لیے خصوصی توجہ محسوس کررہے تھے اس لیے سب اس سے ادب سے پیش آتے۔ ملک ارسلان نہناں کو حویلی لانے کے فیصلے سے مطمئن تھے کیونکہ اس کی آمد کے بعد عنیزہ خوش رہنے لگی تھیں۔ ایک مخصوص اداس اور یاسیت جو عرصہ دراز سے ملک ارسلان کی تمام تر توجہ اور محبت کے باوجود عنیزہ کی شخصیت کا حصہ بنی ہوئی تھی وہ اب کم ہونے لگی تھی۔ وہ زندگی کے معاملات میں پھر سے سرگرم ہوگئی تھیں۔ یہ تبدیلی خوش آئند تھی۔ نہناں بہت مختصر عرصے میں حویلی کا حصہ بن گئی تھی۔

☆ ☆ ☆
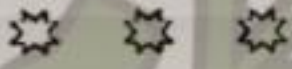
زیان پہلے سے زیادہ گم صم رہنے لگی تھی۔ اپنی تنہائی' بے چارگی اور کسمپرسی کا احساس کچھ اور بھی بڑھ گیا تھا۔ پہلے امیر علی کی زندگی میں کسی اپنے کے ہونے کا فرحت بخش اطمینان ہمراہ تھا۔ ان کے بعد یہ مان اور اطمینان بھی چھین چکا تھا۔

امیر علی کے انتقال کو ایک ماہ سے زائد ہوچکا تھا۔ روبینہ مستقل طور پر زرینہ کے پاس ہی تھیں وہاب صبح و شام چکر لگاتا۔ امیر علی زندہ تھے تو اس کی آمدورفت کو زیادہ پسند نہیں کرتے تھے وہ بھی وقفے وقفے سے آتا پر اب کوئی آڑ کوئی دیوار نہیں رہی تھی۔

زرینہ عدت میں تھیں۔ عفت خانم نے دبے دبے الفاظ میں کمال اور زیان کی شادی کی بات چھیڑی۔

زرینہ نے انہیں اطمینان دلایا کہ عدت ختم ہوتے ہی وہ یہ معاملہ بھی نمٹالیں گی۔ ادھر روبینہ نے امیر علی کی ناگہانی موت اور اس کے بعد بہن کی بیوگی وعدت کو مد نظر رکھتے ہوئے ایک بار بھی وہاب کے رشتے کی بات نہیں چھیڑی تھی۔ پر عفت خانم کی آمد اور شادی کے تقاضے نے ان کے کان کھڑے کردیے۔ پھر وہاب کے صبح وشام کے چکر اس بات کو کہاں تک چھپا سکتے تھے۔ وہ غصے سے آگ بگولہ ہو رہا تھا۔ امیر علی کی موت نے اسے نڈر کردیا تھا۔ پھر زرینہ خالہ کا دم خم ختم ہوچکا تھا وہ اب شوہر سے محروم عام سی عورت تھیں۔ وہاب نے عفت خانم کو ذلیل کرکے وہاں سے چلتا کیا۔ اچھا خاصا تماشا بن رہا تھا۔ اب وہاب جیسے منہ زور کو قابو کرنا مشکل تھا۔

زرینہ کو اب اور خوف ستانے لگے تھے۔ وہ اکیلی اور بے سہارا تھیں۔ میکے میں رشتے داروں کے نام پہ روبینہ اور وہاب کے سوا ان کا کوئی بھی نہیں تھا ادھر امیر علی بھی اکیلے تھے ان کے چند دور پار کے ہی رشتے دار تھے۔ وہ مشکل میں آجاتیں تو کوئی بھی ایسا نہیں تھا وہ جس پہ بھروسا کرتیں۔ خود تو وہ عدت میں تھیں۔

وہاب اور روبینہ آپا ہی گھر کے کرتا دھرتا بنے ہوئے تھے۔ ہر چیز پہ ان کا کنٹرول تھا۔ ان دونوں کی بدلی بدلی کیفیت زرینہ محسوس کررہی تھیں۔ سب سے پہلے تو وہاب نے عفت خانم کو بدتمیزی کرکے گھر سے نکالا پھر روبینہ آپا نے انہیں طویل لیکچر دیا کہ عفت خانم کو اب یہاں کسی صورت بھی قدم نہ رکھنے دیا جائے۔ ویسے بھی وہاب نے جس طرح عفت خانم کو ذلیل اور رسوا کرکے گھر سے نکالا تھا۔ اس کے بعد ان کا یہاں آنا محال ہی تھا۔ ذیان، زرینہ کے گلے کی ہڈی بن گئی تھی نہ نگل سکتی تھیں نہ اگل سکتی تھیں۔

ذیان، بوا کے ساتھ اپنے کمرے میں بیٹھی تھی۔ عفت خانم اور وہاب کا ہنگامہ شروع ہوتے ہی ذیان وہاں سے ہٹ گئی تھی۔ اس کے خوف اور بے چارگی کو محسوس کرکے بوا بھی اس کے پیچھے آگئیں۔

"بوا یہ سب کیا ہو رہا ہے کیوں ہو رہا ہے۔ ہم اپنے ہی گھر میں اجنبی بن گئے ہیں۔ میرے دن رات خوف میں بسر ہو رہے ہیں۔ میں کالج سے آتے ہی اپنے کمرے میں گھس جاتی ہوں۔ ایسے لگتا ہے اس گھر کے در و دیوار میرے لیے پرائے ہوگئے ہیں۔" وہ بے حد شاکی اور ہراساں تھی۔

بوا اسے دیکھ کر رہ گئیں۔ وہ خود امیر علی کے بعد ذیان کو دیکھ دیکھ کر جی میں کڑھتیں۔ کچھ کر بھی نہیں سکتی تھیں۔ آنے والے حالات کا اندازہ انہیں کچھ کچھ ابھی سے ہو رہا تھا۔

"اللہ پہ بھروسا رکھو فکر مت کرو سب اچھا ہوجائے گا۔" انہوں نے بھیگے انداز میں اسے تسلی دی۔ یہ الگ بات کہ یہ تسلی یقین سے خالی تھی۔

☼ ☼ ☼

رنم کام کرتی نوکرانیوں کو ہدایات دے رہی تھی۔ عنیزہ دور بیٹھی ادھر ہی دیکھ رہی تھیں۔ اس کی نظر رنم پہ ہی تھی۔ رات سے ان کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ جانے کیا بات تھی رہ رہ کر دل و دماغ میں عجیب سے خیال آرہے تھے۔ اب رنم کو دیکھتے ہوئے یہ خیال اور بھی طاقتور ہوتے جارہے تھے۔ وہ پیچھے بہت پیچھے ماضی میں جارہی تھیں۔ ماضی میں جانے کا یہ سفر اتنا آسان نہیں تھا انہیں کرب و اذیت کی کئی منزلوں سے گزرنا پڑتا تھا۔

وہ سب کے سامنے سے اٹھ آئیں۔ اس وقت صرف تنہائی اور اندھیرا درکار تھا۔ اندھیرا ہی تو ان کی ٹوٹی پھوٹی روح کو اپنی پناہ میں تحفظ دے سکتا تھا۔ اتنے برس گزر چکے تھے وہ بے خبر تھیں انہیں کچھ خبر نہ تھی جو وہ پیچھے چھوڑ آئی ہیں "وہ متاع جان" کس حال میں ہے۔ کوئی مددگار کوئی سہارا نہ تھا۔

ملک ارسلان ان کی کیفیت دیکھتے ہوئے انہیں صرف تسلی دے سکتے تھے۔ اور اتنے برس سے وہ یہی کررہے تھے۔ لیکن تسلی دلاسوں سے عنیزہ کے زخم کہاں بھرنے والے تھے۔

☼ ☼ ☼

رات لمحہ بہ لمحہ تاریکی کا سفر طے کرتی اپنی منزل کی جانب رواں دواں تھی۔ بوا بہت دیر سے اپنے بستر پہ لیٹی کروٹ بدل رہی تھیں۔ عشاء کی نماز پڑھنے کے بعد وہ معمول کے ذکرواذکار میں کافی دیر مشغول رہیں۔ اصولاً" اب انہیں نیند آجانی چاہیے تھی۔ نیند نہ آنے کی وجہ سے ان کی ذہنی چبھن تھی۔ اس چبھن کو عفت خانم کے ساتھ وہاب کی منہ ماری نے اور بھی بڑھا دیا تھا۔

وہ برسوں سے اس گھر کے مکینوں کی خدمت کرتی چلی آرہی تھیں امیر علی انہیں گھر کا فرد کا درجہ دیتے تھے ان کی ادب و احترام میں امیر علی نے کبھی کوتاہی یا کمی نہیں کی تھی اول دن سے زرینہ بیگم بھی بوا کی اہمیت کو سمجھ گئی تھیں اس لیے ان کے تعلقات بوا کے ساتھ خوشگوار ہی رہے۔ اس میں بوا کی مصلحت آمیز فطرت اور سمجھداری کا بھی دخل تھا۔ وہ سب کی مزاج آشنا تھیں اور اس کے مطابق ہی برتاؤ کرتیں۔ زرینہ کا ذیان کے ساتھ جو رویہ تھا وہ انہیں پسند نہیں تھا ڈھکے چھپے لفظوں میں انہوں نے زرینہ کو اس کا احساس دلانا چاہا پر وہاں سے مطلوبہ ردعمل ظاہر نہ ہونے پر انہوں نے اپنے ہونٹ سی لیے۔

امیر علی کی بیماری سے پہلے سب ٹھیک چل رہا تھا۔ وہ گھر کے سربراہ اور تمام اختیارات کے مالک تھے۔ اختیارات میں طاقت میں تبدیلی آئی تو بہت کچھ بدل گیا۔ زرینہ شوہر پرست عورت تھیں اس کے ساتھ ساتھ وہ ذیان سے سخت عناد بھی رکھتی تھیں۔

وہاب کی ذیان کے ساتھ پسندیدگی اور ذیان کے حصول کی خواہش انہیں ذرہ بھر نہیں بھائی تب ہی تو انہوں نے کمال کے رشتے کے لیے راہ ہموار کی۔ جو وہاب کے غیض و غضب کو اور بھی ہوا دینے کا باعث بنی۔ بوا نے بہت قریب سے وہاب کی فطرت اور عادات کا مشاہدہ کیا تھا وہ کینہ پرور' ضدی اور اپنی مقصد کے حصول کے لیے حد سے گزر جانے والوں میں سے تھا۔

وہاب جنونی تھا اور ذیان کو حاصل کرنے کے لیے

کچھ بھی کر سکتا تھا اب امیر علی نہیں رہے تھے وہ کرتا دھرتا بنا ہوا تھا۔ بلکہ روبینہ نے وہاب کو اور بھی آگے کی راہ دکھائی دی تھی۔ زیان سے وہاب نے ہر حال میں شادی کرنی ہی تھی لیکن زیان کے ساتھ ساتھ اب وہ اس کی جائیداد کا بھی حقدار بننا چاہ رہا تھا۔ روبینہ اور وہ دونوں مل کر اس مقصد پہ کام کر رہے تھے۔

بوا اپنی آنکھیں اور کان کھلے رکھتی تھیں۔ زرینہ بھی کچھ کچھ بھانپ گئی تھیں کیونکہ' روبینہ آپا اور وہاب نے امیر علی کی وراثت کے بارے میں انہیں ہر طرح سے کریدا تھا کہ امیر علی کی کتنی دولت ہے' کتنی جائیداد ہے اور ان کے بینک اکاؤنٹس میں اس وقت کتنا پیسہ موجود ہے۔ زیان کو شادی کے موقعے پر کیا کچھ دیا جائے گا۔

روبینہ پہلے وہاب کی پسند کی وجہ سے زیان کو بہو بنانا چاہ رہی تھی لیکن اب اس میں لالچ کا عنصر بھی شامل ہو گیا تھا۔ روبینہ نے بوا سے بھی بہانے بہانے سے امیر علی کی وراثت کے بارے میں سوال کیے تھے۔ اور اس میں وہاب کی پوری پلاننگ تھی۔ آنے والا وقت انہونیوں کی نوید دے رہا تھا اس لیے بوا بے حد پریشان تھیں۔

رات گھڑی کی ٹک ٹک کے ساتھ گزرتی جا رہی تھی۔ بوا اپنے بستر سے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ وہ دروازے کے قریب اپنی تسلی کرنے کے لیے گئیں حالانکہ دروازہ اندر سے لاک تھا پھر بھی انہوں نے اپنی تسلی ضروری سمجھی تھی۔

کمرے میں زیرو پاور کا بلب جل رہا تھا۔ انہوں نے دوسری لائٹ جلائی۔ اب کمرے میں بھرپور روشنی تھی سب کچھ نظر آ رہا تھا۔ بوا کونے میں رکھے اپنے جستی ٹرنک کی طرف بڑھیں۔ جستی ٹرنک کے ساتھ ہی ایک طرف کپڑوں کی الماری تھی انہوں نے الماری کھول کر چابیوں کا گچھا برآمد کیا۔ جستی ٹرنک پہ موٹا تالا جھول رہا تھا۔ چابیوں کے گچھے میں سے ایک چابی منتخب کر کے انہوں نے تالے پہ آزمائی تو وہ فوراً" کھل گیا۔ انہوں نے آگے جا کر ٹرنک میں رکھی اشیاء باہر نکالنی شروع کر دیں۔

ٹرنک میں رکھی سب چیزیں اب باہر بچھے بستر پر پڑی تھیں۔ ٹرنک کے سب سے نچلے حصے میں ایک پوٹلی پڑی تھی۔ بوا نے کپکپاتے ہاتھوں سے وہ پوٹلی باہر نکالی اور اس کی گرہیں کھولنی شروع کیں۔ ان کا انداز چوکنا اور رازدارانہ تھا۔ رات کے سناٹے میں اس طرح ٹرنک کھول کر کچھ ڈھونڈنا ظاہر کر رہا تھا کہ پوٹلی کے ساتھ یقیناً" کوئی اہم راز وابستہ ہے۔ ورنہ وہ دن کے کسی بھی حصے میں آ کر ٹرنک کھول کر کچھ بھی نکال اور رکھ سکتی تھیں۔

بوا پوٹلی کھول چکی تھیں۔ اس میں رکھی چیزیں بوا کے ہاتھوں میں تھیں۔ اس میں دو سونے کی انگوٹھیاں اور کانوں کی بھاری بالیاں پڑی تھیں۔ بوا نے ان پہ مطلق توجہ نہ دی بلکہ انہوں نے وہ چیزیں ایک طرف رکھ کر پوٹلی میں پڑے ایک شاپر کو باہر نکالا۔ شاپر مضبوط اور گہرے رنگ کا تھا۔ بوا نے شاپر کھول کر اندر موجود لفافے کو باہر نکالا۔ لفافہ مٹیالے رنگ کا تھا۔ اس کے اندر پڑا کاغذ گردش زمانہ سے پیلا اور بوسیدہ ہو رہا تھا۔ بوا نے کانپتے ہاتھوں سے کاغذ کی تہیں کھولنا شروع کیں۔ یہ ایک خط تھا جو برسوں پہلے انہیں تحریر کیا گیا تھا۔ برسوں پہلے جب یہ خط بوا کو بھیجا گیا تھا تب وہ اس کا جواب چاہنے کے باوجود بھی نہ دے پائی تھیں۔ اس ناکامی نے انہیں عجیب سے احساس جرم کا شکار بنا دیا تھا۔ اسی وجہ سے وہ زیان کا بہت خیال رکھتی تھیں' اسے ایک لمحہ کے لیے بھی آنکھوں سے اوجھل نہ ہونے دیتیں۔

زیان ان کے ہاتھوں میں پلی بڑھی تھی انہوں نے ایک ماں کی طرح اس کی ذمہ داریاں نبھائی تھیں۔ راتوں کو اس کے لیے جاگی تھیں اس کے کھانے پینے سے لے کر صفائی ستھرائی و تربیت ہر چیز کا خیال رکھا تھا۔ زرینہ سے امیر علی کی شادی کا ایک سبب زیان بھی تھی۔ پر بوا نے زرینہ بیگم کو زیان کی طرف سے بالکل

بے فکر اور پرسکون کر دیا تھا۔ وہ امیر علی کے باقی تینوں بچوں کی ماں اور محض بیوی تھیں۔ بوا نے بس زیان کو پیدا کرنے کا کرب برداشت نہیں کیا تھا باقی ہر لحاظ سے وہ اس کے لیے ماں جیسی تھیں۔

بوا خط کھول چکی تھیں۔ خط کے مندرجات پہ ان کی نگاہ تیزی سے دوڑ رہی تھی۔ انہیں پتا ہی نہیں چلا کہ کب اور کیسے ان کی آنکھیں بھیگنا شروع ہوئیں۔

اس خط کے جواب دینے کا ٹائم آگیا تھا۔ بوا نے خط پہلے کی طرح پوٹلی میں رکھا اور ٹرنک کی سب چیزیں پھر سے اس میں رکھیں۔ اب سب کچھ پہلے کی طرح تھا۔ رات کا آخری پہر شروع تھا۔ بوا کی تہجد کی نماز کا ٹائم ہو گیا تھا۔ وہ وضو کر کے اپنے اللہ کے حضور جھک گئیں۔

☼ ☼ ☼
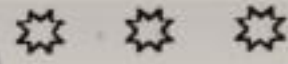
وہاب اپنے گھر کا چکر لگا کر دوپہر میں ادھر زرینہ بیگم کی طرف آگیا تھا۔ زیان کھانا کھا رہی تھی۔ اس کی آواز سنتے ہی کھانا چھوڑ کر کمرے میں چلی گئی۔ ابو کی موت کے بعد سے وہاب اور روبینہ ادھر ہی تھے۔ زیان کو وہاب کی معنی خیز نگاہوں سے عجیب سے گھبراہٹ اور الجھن ہوتی اس لیے اس کی پوری کوشش ہوتی کہ وہ منظر سے غائب رہے۔ اب تو زرینہ کو بھی وہاب کے وجود سے بے زاری ہونے لگی تھی۔ پر وہ عدت میں تھیں اس لیے خون کے گھونٹ پینے پہ مجبور تھیں۔

بوا نے دروازہ بجا کر اسے رات کے کھانے کے لیے باہر بلایا پر اس نے باہر آنے سے انکار کر دیا۔ تب وہ اس کے لیے کھانے کی ٹرے لائیں۔ زیان نے کمرے میں ہی کھانا کھایا۔ کھانا کھانے کے بعد اس نے بلاوجہ ہی کمرے کے چکر کاٹنے شروع کر دیے۔ اس مشغلے سے دل اکتایا تو اس نے ایک کتاب اٹھالی۔ کتاب کا موضوع اتنا دلچسپ تھا کہ اسے وقت گزرنے کا احساس ہی نہ ہوا۔ باہر اب مکمل طور پر سناٹا اور خاموشی طاری تھی۔

اس نے وال کلاک کی طرف دیکھا۔ کافی وقت گزر چکا تھا۔ سناٹا بتا رہا تھا کہ سب خواب خرگوش کے مزے لوٹ رہے ہیں۔ وہ کتاب رکھ کر سونے کے لیے، جونہی بستر پر لیٹی اور بیڈ لیمپ آف کرنے کے لیے بٹن کی طرف ہاتھ بڑھایا اچانک لائٹ چلی گئی۔ کمرا تاریکی میں ڈوب گیا۔ اسے یکدم ہی اندھیرے سے ڈر لگنے لگا۔ کھڑکی کی طرف جاتے ہوئے بھی خوف محسوس ہو رہا تھا۔ اے سی اور پنکھا بند ہوا تو تھوڑی دیر میں ہی بند کمرے کی وجہ سے گھٹن بڑھنے لگی۔ اس کی قمیص بھیگ کر جسم سے چپک گئی تھی۔

زیان سے مزید گرمی برداشت نہیں ہو رہی تھی۔ اس نے اٹھ کر آہستگی سے اپنے کمرے کا دروازہ کھولا اور ادھر ادھر دیکھا۔ باہر ہنوز خاموشی اور سناٹا طاری تھا۔ اس نے کمرے سے باہر قدم رکھا۔

اندھیرا ہونے کے باوجود وہ بہت تیزی تیزی سے سیڑھیاں طے کر کے اوپر چھت پر آگئی تھی۔ چھت پر آتے ہی اسے احساس ہوا کہ یہاں اس کے علاوہ کوئی اور ذی نفس پہلے سے موجود ہے۔ اس کی ریڑھ کی ہڈی میں سرد سی لہر دوڑ گئی۔ اس کی چھٹی حس نے اسے خبردار کیا۔ اور اس کی چھٹی حس کبھی غلط نہیں کہتی تھی۔

(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)

☼ ☼